جولائی ۱۹۶۳ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیر ادارت

امین احسن اصلاحی

قیمت فی پرچہ ساٹھ پیسے۔

سالانہ چھ روپے (پندرہ شلنگ)

جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۵، ۶، ۷

ربیع الاوّل ۱۳۸۴ھ

فہرستِ مضامین

تذکرہ و تبصرہ — امین احسن اصلاحی ۲

تدبرِ قرآن

تفسیر سورۂ بقرہ — امین احسن اصلاحی ۹

افاداتِ فراہیؒ

عصمتِ انبیاء — خالد مسعود صاحب ۳۶

مقالات

مولانا محمد علی مدرسۃ الاصلاح میں — امین احسن اصلاحی ۴۳

تقریظ و تنقید

قرآنی حقائق — خ-م ۴۷

ماہنامہ میثاق لاہور

ترسیلِ زر اور خط و کتابت کا پتہ

مینجر ماہنامہ میثاق

رحمانپورہ — اچھرہ لاہور ۱۲

ہندوستانی خریداروں کیلئے ترسیلِ زر کا پتہ

مینجر ہفت روزہ ندائے ملّت

باغ گونگے نواب — لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

مجھے نہایت گہرے احساس ندامت کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑ رہا ہے کہ میں میثاق کی اشاعت کی بے نظمی پر انتہائی کوشش کے باوجود قابو نہ پا سکا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ رسالہ برابر خسارہ کے ساتھ نکل رہا ہے اور یہ خسارہ اتنا زیادہ ہے کہ اس کو پورا کرنا سخت مشکل ہو رہا ہے۔ اس خسارے کا زیادہ حصہ اگرچہ رسالے کے بعض قدرداں اب تک پورا کر رہے ہیں اور یقیناً وہ یہ ایثار اس کام کو ایک دینی خدمت سمجھ کر کر رہے ہیں لیکن جو رسالہ پانچ سال کی مدت میں اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکا اس کو کھڑے رکھنے کے لئے ان مخلصین کو برابر زحمت دیئے جانا چاہیے ان پر بار نہ ہو لیکن یہ خود میری طبیعت پر ایک ایسا بار ہے کہ اس کو مزید اٹھانا مجھ پر بڑا شاق گزر رہا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر رسالے کے مضامین کی نوعیت اور اس کے مزاج میں مذاق عام کی رعایت سے کچھ تبدیلی کر دی جائے تو اس کے خریداروں میں کچھ اضافہ ہو جائے گا لیکن یہ بات میرے اختیار میں نہیں ہے۔ میں صرف اسی طرح کی چیزیں لکھ سکتا ہوں جس طرح کی چیزیں رسالے میں نکلتی رہی ہیں۔ پھر سوال صرف لکھ سکنے ہی کا نہیں ہے بلکہ ضمیر کا بھی ہے۔ میرا دل اس بات پر کبھی راضی نہیں ہوتا کہ اس رسالے میں کوئی ایسی چیز نکلے جس کی کوئی خاص مذہبی و علمی قدر و قیمت نہ ہو اور مقصود جس سے محض توسیع اشاعت ہو۔ اگر اس پابندی کے سبب سے رسالے کا حلقہ وسیع نہیں ہو سکتا تو نہ ہو، اس کو دور کرنا میرے امکان میں نہیں ہے۔

مالی خسارہ کے علاوہ بعض اور باتیں بھی وقتاً فوقتاً مزاحم ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ میری اور

میرے متعلقین کی معاش کا انحصار ایک مدت سے تمام تر زمینداری پر ہے۔ اگر میں اس کی دیکھ بھال نہ کروں تو معاش کا مسئلہ پیچیدہ ہو جاتا ہے اور اگر اس کی دیکھ بھال کی طرف توجہ کرتا ہوں تو علمی مشاغل کو صدمہ پہنچتا ہے۔ یہ دونوں کام ایک دوسرے کے رقیب واقع ہوئے ہیں اور ان دونوں رقیبوں کی کشاکش کے درمیان میرا حال کم و بیش وہی ہے جس کا ذکر مرزا غالب صاحب نے فرمایا ہے۔

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

علاوہ ازیں اب میری صحت بھی کچھ اچھی نہیں رہی۔ اگر زیادہ مشقت کا بار پڑ جائے تو ایسے عوارض ابھر آتے ہیں جن سے لکھنے پڑھنے کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے اور پھر اس کے بحال ہونے میں دیر لگ جاتی ہے۔ میثاق کی اشاعت میں اس سے بھی خلل پڑتا ہے۔ رفقاء میں سے جو اس کام میں میری مدد کرتے ہیں ابھی وہ تنہا اپنے اعتماد پر رسالہ شائع کر دینے کی ذمہ داری نہیں اٹھاتے۔ شاید ان کو اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے کے لئے میرے مرنے کا انتظار ہے۔ ویسے ان بیچاروں کی اپنی مصروفیات بھی بہت ہیں۔ میرے کاموں میں وہ کوئی شرکت اگر کرتے ہیں تو اپنے ذاتی حالات سے لڑ کر کرتے ہیں اور محض علم دین کی محبت میں کرتے ہیں۔

میثاق کے علاوہ میرے سر اور بھی بعض کام ہیں جو مجھے لاہور میں رہتے ہوئے لازماً انجام دینے ہوتے ہیں۔ صحت کی حالت میں تین چار گھنٹے روزانہ تفسیر تدبر قرآن کی تسوید و تحریر پر صرف ہوتے ہیں۔ کم از کم حلقہ تدبر قرآن کے لئے تیاری اور درس و تعلیم پر صرف ہو جاتے ہیں، دو تین گھنٹے مراسلات، اخبارات و رسائل اور ملاقاتوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ بس اس سے زیادہ کام کرنے کی قوت اب مجھ میں باقی نہیں رہی ہے۔

یہ حالات میں نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس لئے لکھ دیئے ہیں کہ میثاق کے قارئین پر یہ بات واضح رہے کہ رسالہ اس وقت ایک مشکل دور سے گزر رہا ہے، اگر یہ بند ہو جائے تو وہ اس کو مجبوری پر محمول فرمائیں۔ بند ہو جانے کی صورت میں ان خریداروں کے قرضوں کی ادائیگی میں ذمہ دار ہوں جن کی مدت خریداری ابھی باقی ہے۔ ان شاء اللہ مکتبہ کی کتابوں کی صورت میں یا نقد کی صورت میں ان کے قرضے ضرور ادا کر دوں گا۔

یہ میں نے جو کچھ لکھا ہے محض ایک اندیشے کا اظہار ہے، آخری فیصلہ نہیں ہے۔ آخری فیصلہ رسالہ کے ہمدرد اور معاونین حضرات فرمائیں گے۔ جہاں تک میرے دل کا تعلق ہے وہ اس کے بند ہو جانے پر راضی نہیں ہے۔ لیکن ہمیشہ وہی نہیں ہوتا جس کو انسان کا دل چاہتا ہے بلکہ ہوتا وہ ہے جس کو خدا چاہتا ہے اور میرا عقیدہ بھی ہے اور زندگی بھر کا تجربہ بھی کہ خدا وہی چاہتا ہے جو بہتر ہوتا ہے۔ اگر اس کی مرضی یہی ہے کہ یہ بند ہو جائے تو میں اس کے فیصلہ پر راضی ہوں۔

ابھی حسابات کی جانچ پڑتال نہیں ہوئی ہے لیکن سرسری اندازہ یہ ہے کہ اس وقت رسالے پر کم و بیش ایک ہزار کا بار ہے اور اگر اس کے کل واجبات وصول ہو جائیں جس کی اُمید بہت کم ہے تب بھی اس بار کا زیادہ حصہ مجھی کو ادا کرنا پڑے گا۔ ہر چند کہ پانچ سال کے عرصے میں اس رسالے سے کوئی مالی فائدہ بھی میں نے نہیں اُٹھایا۔

اگر رسالہ بند ہوتا ہے تو اس کے ذریعہ سے اس کے قدر دانوں سے یہ میری آخری ملاقات ہے۔

(۲)

ماضی قریب میں جو واقعات پیش آئے ہیں ان میں بھارت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی موت ایک عظیم حادثہ ہے۔ اگرچہ وہ خدا اور مذہب کے منکر تھے لیکن اپنی قوم اور اپنے وطن کے سچے پرستار تھے اور اس معاملے میں وہ وفاداری اور پختہ زناری کی مثال قائم کر گئے۔ دنیا میں وزیر اعظم بہت گزرے ہیں اور بہت گزریں گے لیکن بھارت جیسے وسیع الاطراف اور مختلف الاقوام ملک میں ہر دل عزیزی کا جو مقام جواہر لال کو حاصل ہوا اس کی مثال مشکل سے مل سکے گی۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ انہوں نے اپنے طویل دورِ حکومت میں اپنی قوم کے جسموں ہی پر نہیں بلکہ ان کے دلوں پر حکومت کی ہے اور حکومت در حقیقت وہی ہے جو دلوں پر ہو۔

پنڈت جی کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ میں زمام اقتدار آئی ہے ہماری دلی آرزو ہے کہ وہ پنڈت جی کے ناتمام کاموں کو تکمیل تک پہنچا سکیں۔ پنڈت جی جمہوریت کے بڑے دلدادہ تھے اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ اس کو قائم رکھنے میں کامیاب رہے لیکن جمہوریت کا ایک کمزور پہلو یہ ہے کہ جب تک اس کی پشت پر نہایت مضبوط ہر دل عزیز عوامی لیڈر نہ ہو اس کی حفاظت

ناممکن ہے۔ جواہر لال کے بعد اب یہ چیز بھارت کو حاصل نہیں رہی۔ اس مسئلہ پر اب اس کے لیڈروں کو سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا ورنہ جمہوریت کا مستقبل اب اس ملک میں خطرناک اندیشوں سے دوچار ہے۔ اور اس کے جو بدل متوقع ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کا خوش دلی سے خیر مقدم کیا جا سکے۔

پنڈت جی سیکولرزم کے بھی بڑے دلدادہ رہے لیکن اس میں ان کو شدید ناکامی سے سابقہ پیش آیا۔ رجعت پسند عناصر نے اس سلسلے کی ان کی تمام مساعی کو ناکام بنا دیا اور پنڈت جی ان کے مقابل میں وہ زور نہ دکھا سکے جس کی ان سے اُمید تھی بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اس معاملے میں ہمیں ان سے بڑی مایوسی ہوئی۔ اس کے وجوہ سے بحث نہیں۔ وجوہ جو کچھ بھی ہوں بہرحال ہم یہ تصور نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے دورِ اقتدار میں مسلمانوں کا اس طرح شہر شہر میں قتل عام ہوگا جس طرح ہوا اور پنڈت جی اس کو اس طرح ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر لیں گے جس طرح انہوں نے برداشت کر لیا۔ ہمیں ان سے گاندھی جی کی جرأت کی اُمید تو نہیں تھی لیکن اس کمزوری کی بھی اُمید نہیں تھی جو ان سے ظاہر ہوئی۔ اگر وہ اپنے دورِ اقتدار میں صرف حکومت کے کارندوں اور اپنی پولیس ہی کو سیکولر ذہن کا بنانے میں کامیاب ہو گئے ہوتے تو بھارت میں مسلمان خود اپنی حفاظت کرنے میں کامیاب ہو جاتے اور اس طرح کے واقعات ہرگز نہ پیش آتے جن کو دیکھ کر بھارت کے مسلمان تو درکنار خود انسان کے مستقبل کی طرف سے مایوسی ہو جاتی ہے۔

پنڈت جی کے جانشینوں سے ہمیں اُمید ہے کہ وہ اس مسئلہ میں پنڈت جی کی نہیں بلکہ مہاتما گاندھی جی کی پیروی کریں گے اور سر دے کر اپنے ملک کے ناموس کو وحشیوں اور درندوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ ہم ان لوگوں میں نہیں ہیں جو یہ رائے رکھتے ہوں کہ جو کام پنڈت جواہر لال نہرو سے نہ ہو سکا وہ لال بہادر شاستری کیا کر سکیں گے۔ کر سکنے اور نہ کر سکنے کا سوال نہیں ہے، سوال صرف کرنے کے سچے اور پکے ارادے کا ہے۔ ہمیں تو اگر یہ نظر آ جائے کہ بھارت میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کو انسانی اقدار گاندھی جی کی طرح عزیز ہیں تو ہمارے اطمینان کے لئے یہ بس ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ ان کی جان بازیوں کے نتائج کیا نکلتے ہیں۔

کشمیر کے مسئلہ میں بھی پنڈت جی کی روش ہمارے لئے نہایت حیران کن رہی۔ اس مسئلہ

میں انہوں نے حیرت انگیز پریشان خیالی بلکہ نہایت مایوس کن ضد کا مظاہرہ کیا جس کی وجہ سے ان کے اور ان کے ملک کے وقار کو بڑا نقصان پہنچا۔ لیکن اب زندگی کے آخری ایام میں غالباً ان پر خاص اس معاملے میں جذباتیت کی جگہ حقیقت پسندی غالب آگئی تھی جس کی وجہ سے انہوں نے شیخ عبداللہ کو رہا کر کے اس کے طے کرنے کی راہ کھولی۔ اگرچہ افسوس ہے کہ اب وہ اس دنیا پر نہیں رہے لیکن ہمارا اندازہ یہ ہے کہ اس سے اس معاملے کے طے ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی بلکہ شاید اس کے لئے زیادہ سازگار فضا پیدا ہوگئی ہے۔ خدا کرے ہمارا یہ اندازہ صحیح نکلے اور بھارت اور پاکستان کے لیڈر اور شیخ عبداللہ اس قضیئے کو طے کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اسی قضیہ کے طے ہونے پر پاکستان اور بھارت کی دوستی کا انحصار ہے اور اسی دوستی پر دونوں کی ترقی کا دار و مدار ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ صدر ایوب اور بھارت کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری دونوں اس دوستی کی قدر و قیمت سمجھتے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ ان دونوں لیڈروں کے ذریعہ سے پاکستان اور بھارت کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوگا اور شیخ عبداللہ اس دور کے فاتح باب قرار پائیں گے۔

(۳)

ہمارے ملک میں اب انتخابات کی گہما گہمی شروع ہونے والی ہے جس کے ابتدائی آثار ظاہر ہونے شروع ہوگئے ہیں۔ انتخابات جمہوریت کی جان ہیں اور ان کی قدر و قیمت کا انحصار اس امر پر ہے کہ یہ ہر قسم کے سرکاری اور غیر سرکاری اثر و اقتدار کی ناروا مداخلت سے آزاد ہوں۔ ہمیں خوشی ہے کہ ذمہ داروں کی طرف سے بار بار یہ اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ اس میں کوئی مداخلت نہ ہونے دی جائے گی۔ ہمیں امید ہے کہ یہ اطمینان دہانی بالکل سچی ثابت ہوگی اور صدر ایوب جس طرح پچھلے انتخابات کے معاملے میں نیک نام رہے ہیں اس سے زیادہ وہ ہونے والے انتخابات میں نیک نام رہیں گے۔ مملکت کے سربراہ ہونے کے پہلو سے انہی پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ وہ اس ملک کو، جو بدقسمتی سے گزشتہ ادوار میں جمہوریت کے آداب و رسوم سے آشنا نہ ہو سکا، اس چیز سے آشنا کریں اور اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیں کہ اس ملک میں جو انقلاب وہ لائے اس سے مقصود ملک کے عوام کو اختیار و آزادی سے محروم کرنا نہیں بلکہ اختیار و آزادی سے ہم کنار کرنا ہے۔

ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جمہوریت کی کوئی ایک ہی متعین شکل نہیں ہے بلکہ اس کی شکلیں مختلف ہیں۔ اس وجہ سے ہم یہ مانتے ہیں کہ اس راہ سے بھی جمہوریت کے نصب العین تک پہنچا جا سکتا ہے جو ہمارے ملک میں صدر ایوب نے اختیار فرمائی ہے لیکن اس کے لئے یہ شرط ضروری ہے کہ انتخابات اپنے ہر مرحلہ میں آزادانہ ہوں اور حکومت اپوزیشن پارٹیوں کے معاملہ میں فراخ دلانہ رویہ اختیار کرے۔ اگرچہ اپوزیشن پارٹیوں پر بھی یہ بہت بھاری ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ وہ اپنے فکر و عمل میں سنجیدہ ہوں اور ملک و ملت کے مفاد کو ہر چیز پر مقدم رکھیں اور مخالفت برائے مخالفت کی کورانہ روش سے احتراز کریں لیکن حقیقی جمہوریت کی پسندیدہ روایت یہی ہے کہ حزب اقتدار ان معاملات میں اپوزیشن کو بہت دور تک گنجائش دیتی ہے اور اس چیز کو ملک میں جمہوریت کے فروغ کی ایک علامت سمجھا جاتا ہے۔

اسی معروف روایت کے تحت ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں بھی اپوزیشن پارٹیوں کے ساتھ حزب اقتدار فیاضانہ روش اختیار کریگی۔ رواداری سے رواداری اور فیاضی سے فیاضی پیدا ہوتی ہے اور اس طرح ملک میں صحتمند رجحانات کو ترقی ہوتی ہے۔ ہم صدر ایوب سے یہ بھی درخواست کرتے ہیں کہ اگر وہ کالعدم جماعت اسلامی سے پابندی اٹھا کر اس کو بھی انتخابات میں حصہ لینے کا موقع دیں تو اس سے ہونے والے انتخابات کی قدر و قیمت میں بڑا اضافہ ہو جائے گا۔ ہمیں اس معاملے کے قانونی پہلوؤں سے بحث نہیں، کسی امر کے قانونی پہلوؤں کو طے کرنا عدالتوں کا کام ہے، ہم اس کے سیاسی پہلو کو سامنے رکھ کر یہ عرض کرتے ہیں کہ اگر جماعت اسلامی کو بھی انتخابات میں حصہ لینے کا موقع دے دیا جائے تو اس طرح ان لوگوں کی زبانیں بند ہو جائیں گی جو ملک کے اندر اور باہر لوگوں کو یہ تاثر دینا چاہیں گے کہ یہ انتخابات اپوزیشن پارٹیوں کو جیلوں میں بند کر کے کرائے گئے ہیں ہمیں اچھی طرح اندازہ ہے کہ اس وقت ملک میں صدر ایوب کو اور ان کے واسطہ سے ان کی پارٹی کو جو مقبولیت حاصل ہے اس کو چیلنج کرنے کے پوزیشن میں کوئی بھی نہیں ہے ایسی صورت میں یہ بات دانشمندی کے بالکل خلاف ہوگی کہ کسی جماعت کو پابند رکھ کر انتخابات کے متعلق لوگوں میں خواہ مخواہ ایک غلط تاثر پھیلنے اور پھیلانے کا موقع فراہم کیا جائے۔ ہر شخص جو ملک کے حالات پر نظر رکھتا ہے اندازہ کر سکتا ہے کہ موجودہ حالات میں اگر جماعت اسلامی میدان انتخابات میں آ بھی جائے تو اس

سے صورت حال میں کسی قابل ذکر تبدیلی کا امکان نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ہائیکورٹ کے فل بنچ کے فیصلہ کے بعد حکومت کی پوزیشن تہمت اور شبہ سے بھی بری ہو چکی ہے اس وجہ سے اگر حکومت جماعت کے معاملہ میں فیاضانہ رویہ اختیار کرے گی تو اس کا ملک کے ہر طبقہ پر نہایت اچھا اثر پڑے گا اور ہونے والے انتخابات سے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، نہایت خوشگوار توقعات قائم ہونگی۔

ہم نے یہ جو کچھ عرض کیا ہے محض حکومت کی خیر خواہی کے جذبہ کے تحت عرض کیا ہے۔ ورنہ ہر شخص جانتا ہے کہ ہمیں جماعت کے نظریات، اس کے طریقہ کار اور اس کے لب ولہجہ ہر چیز سے اختلاف ہے اس اختلاف کے باوجود جہاں تک ہمارا علم ہے اس کی بنا پر ہماری رائے یہی ہے کہ یہ لوگ ملک وملت کے خیر خواہ ہیں اور اپنے فہم وبصیرت کے حد تک ملک وقوم ہی کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ حکومت کی فیاضی کا ان لوگوں کے ذہنوں پر بھی اچھا اثر پڑے گا اور یہ حالات کا حقیقت پسندانہ نقطہ نظر سے از سر نو جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔

(۴)

میثاق کی پچھلی اشاعت میں ڈاکٹر فضل الرحمان صاحب کے خاندانی منصوبہ بندی والے مضمون پر ہم نے جو تنقید لکھنے کا وعدہ کیا تھا افسوس ہے کہ اس اشاعت میں اس وعدے کو ہم پورا نہ کر سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض مجبوریوں کے سبب سے ادھر مجھے اپنے مستقر سے پورا سوا مہینہ غیر حاضر رہنا پڑا۔ اس کے بعد آیا تو گردے کے بعض عوارض اُبھر آئے جن کے سبب سے وہ نشاط خاطر بہم نہ ہو سکا جو لکھنے پڑھنے کے کام کے لئے ضروری ہے۔ اگرچہ یہ ممکن تھا کہ تنقید کی ایک قسط اس اشاعت میں دے دی جاتی باقی آئندہ پر اُٹھا رکھی جاتی لیکن اس خیال سے کہ صحت نسبتاً زیادہ بہتر ہونے کی صورت میں مضمون زیادہ دلجمعی کے ساتھ لکھا جا سکے گا میں نے اس کو آئندہ اشاعت کے لئے اٹھا رکھا ہے خدا نے چاہا تو آنے والے شمارے میں یہ مضمون شائع ہو سکیگا۔

(۵)

حلقہ تدبر قرآن کا کام بفضل اللہ پوری سرگرمی سے جاری ہے۔ اُدھر رفقا کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اور مزید اضافے کی توقع ہے۔ نئے آنے والوں کا میں ابھی (باقی صفحہ ۳۵ پر ملاحظہ ہو)

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

۳۹

تفسیر سورۃ بقرۃ

آگے کا سلسلۂ کلام آیات ۲۴۳-۲۵۳

یہاں ذرا پیچھے مڑ کر سلسلہ کلام کو ذہن میں پھر تازہ کر لیجیے۔ فصل ۴۷ میں ہم اشارہ کر آئے ہیں کہ اصل بیان تو بیت اللہ کے تعلق سے جہاد و انفاق کا ہو رہا تھا لیکن انفاق کی بحث نے یتیموں کی صلاح و فلاح اور ان کی ماؤں کے ساتھ نکاح کا سوال سامنے کر دیا اور اس طرح نکاح طلاق سے متعلق بعض مناسب وقت مسائل کے بیان کے لئے ایک تقریب پیدا ہو گئی۔ قرآن کا طریقہ یہی ہے کہ جب کسی مسئلہ کے بیان کے لئے تقریب پیدا ہو جاتی ہے تو اصل سلسلہ بیان کو روک کر اس مسئلہ سے متعلق اتنی باتیں بیان کر دیتا ہے جتنی باتوں کے لئے وقت کے حالات تقاضا کر رہے ہوتے ہیں اور پھر اصل سلسلہ بیان شروع ہو جاتا ہے چنانچہ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ نکاح و طلاق سے متعلق مناسب وقت مسائل کر چکنے کے بعد اصل بیان جہاد و انفاق کا پھر شروع ہو گیا۔

آگے کے مطالب کی ترتیب یوں ہے کہ پہلے بنی اسرائیل کے ایک واقعہ کا حوالہ دیا ہے کہ وہ ایک بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود اپنے دشمنوں کے ڈر سے اپنا وطن چھوڑ کے بھاگ کھڑے ہوئے اور اس طرح انہوں نے اپنے لئے اخلاقی اور سیاسی موت خود اختیار کر لی۔ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرنے سے مقصود مسلمانوں کو متنبہ کرنا ہے کہ انہوں نے مکہ سے مدینہ کو جو ہجرت کی ہے تو یہ موت اور دشمن سے فرار نہیں ہے بلکہ کفر اور فتنہ سے فرار ہے اور اصل مقصد اس سے جانیں بچانا نہو،

بلکہ اللہ کے دین کی نصرت اور اس کی راہ میں جہاد کے لئے منظم ہونا ہے۔

اس تمہید کے بعد مسلمانوں کو جہاد و انفاق پر ابھارا ہے اور ساتھ ہی بنی اسرائیل کی اس جنگ کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے جس کی تحریک ان کے ہاں بھی بعینہٖ اسی مقصد کے لئے مسلمانوں کو یہاں جہاد پر ابھارا جا رہا ہے۔ یعنی بنی اسرائیل نے بھی یہ جنگ اپنے قبلہ کی آزادی کے لئے لڑی تھی۔ اور مسلمان بھی اپنے قبلہ ہی کی آزادی کے لئے اُٹھ رہے تھے۔

بنی اسرائیل اپنی اس جنگ کے مختلف مراحل میں جن آزمائشوں سے گزرے اور جن فتنوں میں مبتلا ہوئے وہ بڑے ہی سبق آموز تھے اس وجہ سے مسلمانوں کو جو بعینہٖ انہی مراحل سے گزرنے کے لئے کمربستہ ہو رہے تھے ان کی سرگزشت کا یہ حصہ سنا دینا ضروری تھا تاکہ وہ اس سے سبق حاصل کریں اور ان فتنوں سے اپنے آپ کو بچا سکیں جو آگے کے مراحل میں پیش آسکتے ہیں۔

اس کے بعد چند آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے یہ فرمایا ہے کہ اس سرگزشت کے ذکر سے مقصود داستاں سرائی نہیں ہے بلکہ یہی کچھ تمہارے سامنے بھی آنے والا ہے اور اس سے تمہاری نبوت کی تصدیق ہوگی لیکن بنی اسرائیل خود اپنے آئینہ میں بھی تمہاری تصویر دیکھ لینے کے باوجود اسی طرح اپنی ضد اور مخالفت پر اڑے رہینگے، سو ان کی مخالفت کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے خدا تمہاری نصرت فرمائے گا۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمایئے۔

ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۲۴۳-۲۵۳

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۲۴۳ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۲۴۴ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ۭ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۠ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۲۴۵ اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ۭ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَاۗىِٕنَا ۭ فَلَمَّا كُتِبَ

وقف لازم

عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝٢٤٦ وَقَالَ لَهُمْ
نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ۗ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ
عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۗ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ
اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۗ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ
مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝٢٤٧ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ
يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى
وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝٢٤٨ ٣٢ ع ١٤
فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ
فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا
مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۗ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا
الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۗ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ
فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝٢٤٩ وَلَمَّا
بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ
انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝٢٥٠ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ
وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ
بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝٢٥١ تِلْكَ اٰيٰتُ
اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۗ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝٢٥٢ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا الجزء ٣
بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۗ وَاٰتَيْنَا وقف لازم
عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۗ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ
الَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ
مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ۗ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۗ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ
مَا يُرِيْدُ ۝٢٥٣ ٣٣ ع ١

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو ہزاروں کی تعداد میں ہونے کے باوجود موت کے ترجمہ

ڈر سے اپنے گھروں سے بھاگ کھڑے ہوئے تو اللہ نے ان کو کہا کہ جاؤ مر جاؤ، پھر اللہ نے ان کو زندہ کیا، اللہ لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر گزار نہیں ہوتے ۲۴۳۔

اور اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور یہ خوب سمجھ رکھو کہ اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے اور کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے کہ اللہ اس کو اس کے لئے کئی گنا بڑھائے اللہ ہی ہے جو تنگ دستی بھی دیتا ہے اور کشادگی بھی دیتا ہے اور اسی کی طرف تم کو لوٹنا بھی ہے۔ ۲۴۴ - ۲۴۵ -

کیا تم نے بنی اسرائیل کے سرداروں کو نہیں دیکھا جب کہ موسیٰ کے بعد انہوں نے اپنے ایک نبی سے کہا کہ آپ ہمارے لئے ایک امیر مقرر کر دیجئے کہ ہم خدا کی راہ میں جہاد کریں۔ اس نے کہا، ایسا نہ ہو کہ تم پر جہاد فرض کر دیا جائے تو تم جہاد نہ کرو۔ وہ بولے کہ بھلا ہم اللہ کی راہ میں جہاد کیوں نہ کریں گے جب کہ ہم اپنے گھروں اور اپنے بچوں سے نکالے گئے ہیں۔ پھر جب ان پر جہاد فرض کر دیا گیا تو ان کی ایک قلیل تعداد کے سوا سب منہ موڑ گئے اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ اور ان کے نبی نے ان کو بتایا کہ اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو امیر مقرر کر دیا ہے۔ وہ بولے کہ بھلا اس کی امارت ہمارے اوپر کیسے ہو سکتی ہے جبکہ اس سے زیادہ حقدار ہم اس امارت کے ہیں اور اسے تو مال کی وسعت بھی حاصل نہیں ہے۔ نبی نے کہا اللہ نے تمہاری سرداری کے لئے اسی کو چنا اور اس کو علم اور جسم دونوں میں کشادگی عطا فرمائی ہے۔ اللہ اپنی طرف سے جسے چاہے اقتدار بخشے، اللہ بڑی سمائی اور بڑا علم رکھنے والا ہے۔ اور ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اس کی امارت کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق آجائے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے سامان تسکین اور آل موسیٰ و آل ہارون کی چھوڑی ہوئی یادگاریں ہیں، صندوق کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ اس میں تمہارے لئے بڑی نشانی ہے، اگر تم ایمان رکھنے والے ہو۔ ۲۴۶ - ۲۴۷ - ۲۴۸ -

پھر جب طالوت فوجوں کو لے کر چلے تو انہوں نے بتایا کہ اللہ ایک ندی کے ذریعہ سے تمہاری جانچ کرنے والا ہے تو جو اس میں سے پی لے گا وہ میرا ساتھی نہیں اور جو اس کو نہیں چکھے گا تو بے شک وہ میرا ساتھی ہے، مگر یہ کہ کوئی اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے۔ تو انہوں نے اس میں سے خوب پیا، صرف ان میں سے تھوڑے لوگ اس سے بچے۔ پھر جب طالوت اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ایمان پر ثابت قدم رہے دریا پار کر گئے تو یہ لوگ بولے کہ اب ہم میں تو جالوت اور اس کی فوجوں سے لڑنے کی طاقت نہیں، جو لوگ یہ گمان رکھتے تھے کہ بالآخر انہیں اللہ سے ملنا ہے انہوں نے للکارا کہ کتنی چھوٹی جماعتیں رہی ہیں جو اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آگئی ہیں، اللہ تو ثابت قدموں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور جب جالوت اور اس کی فوجوں سے ان کا سامنا ہوا تو انہوں نے دعا کی، اے ہمارے پروردگار ہم پر صبر انڈیل دے ہمارے قدم جمائے رکھ، اور کافر قوم پر ہمیں غلبہ عطا فرما۔ تو اللہ کے حکم سے انہوں نے ان کو شکست دی۔ اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے اس کو بادشاہی اور حکمت بخشی اور اس علم میں سے اس کو سکھایا جس میں سے وہ چاہتا ہے۔ اور اگر اللہ ایک کو دوسرے کے ذریعہ سے دفع نہ کرتا رہتا تو زمین فساد سے بھر جاتی لیکن اللہ دنیا والوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ ۲۴۹-۲۵۰-۲۵۱۔

یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمہیں سناتے ہیں مقصد کے ساتھ اور بے شک تم اللہ کے رسولوں میں سے ہو۔ یہ رسول جو ہیں ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی، ان میں سے بعض سے اللہ نے کلام کیا، اور بعض کے درجے بلند کئے اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو کھلی کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس سے اس کی تائید کی۔ اگر اللہ چاہتا تو ان کے بعد والے واضح دلائل کے بعد نہ لڑتے لیکن انہوں نے اختلاف کیا، سو ان میں سے کچھ ایمان لائے اور کچھ نے کفر کیا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ اختلاف نہ کر پاتے لیکن اللہ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ ۲۵۲-۲۵۳۔

○

الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝ ۲۴۳

"الم تر" کے خطاب کی نوعیت

"الم تر" کا خطاب ضروری نہیں کہ واحد کے لئے ہو بلکہ یہ عموماً، جیسا کہ استاذ امامؒ نے سورہ فیل کی تفسیر میں واضح کیا ہے، جمع کے لئے آتا ہے اور خطاب اس میں گویا مخاطب گروہ کے ہر شخص سے فرداً فرداً ہوتا ہے۔ اس کے بعد جس واقعہ کا حوالہ دیا جاتا ہے وہ یا تو مخاطب گروہ کا عینی مشاہدہ ہوتا ہے یا واقعہ کی شہرت اس درجے کی ہوتی ہے کہ اس کی نسبت یہ باور کیا جاتا ہے کہ اس سے مخاطب باخبر ہیں یا انہیں باخبر ہونا چاہیئے۔ یا متکلم کو یہ اعتماد ہوتا ہے کہ واقعہ کی صداقت ایسی مسلم ہے کہ اس میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں ہے۔

الفاظ موت و حیات کا مفہوم

موت کے لفظ پر اسی سورہ کی آیت ۲۸ کے تحت ہم لکھ چکے ہیں کہ قرآن میں یہ لفظ جس طرح زندگی کے فنا ہونے کے لئے استعمال ہوا ہے اسی طرح نیند، بیہوشی اور اخلاقی و ایمانی موت کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ وہاں ہم نے لسان العرب کا حوالہ دیا ہے۔ یہاں قرآن کے بعض نظائر ملاحظہ ہوں۔ اللہ یتوفی الانفس حین موتہا ۴۲۔ زمر (اللہ جانوں کو وفات دیتا ہے ان کی نیند کے وقت) ثم بعثناکم من بعد موتکم لعلکم تشکرون ۵۶۔ بقرہ (پھر ہم نے تمہاری بیہوشی کے بعد تم کو اٹھایا تاکہ تم شکر کرو) انک لا تسمع الموتی ولا تسمع الصم الدعاء ۸۰ نمل (تم اپنی دعوت مردہ دلوں اور بہروں کو نہیں سنا سکتے) اومن کان میتا فاحییناہ وجعلنا لہ نورا یمشی بہ فی الناس ۱۲۲۔ انعام (کیا وہ جو مردہ دل تھا تو ہم نے اس کو حیات ایمانی بخشی اور اس کو نور ہدایت عطا کیا جس کو لے کر لوگوں کے درمیان چلتا ہے)

اسی طرح حیات کا لفظ بھی مادی زندگی سے لے کر نیند سے بیداری اور ایمانی و اخلاقی زندگی تک سب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس کی ایک واضح نظیر تو انعام کی مقدم الذکر آیت میں موجود ہے۔ دوسری واضح تر نظیر انفال سے ملاحظہ ہو۔ استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم ۲۴ انفال

(اللہ اور رسول کی دعوت پر لبیک کہو جب کہ وہ تمہیں بلاتا ہے اس چیز کی طرف جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے)

واقعہ جس کی طرف آیت میں اشارہ ہے

اس آیت میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے اس کا تعلق بنی اسرائیل کی تاریخ کے اس دور سے ہے جس کا ذکر صحیفۂ سموئیل میں ہے۔ سموئیل نبی کے ظہور کے ابتدائی دور میں بنی اسرائیل سخت انتشار میں مبتلا تھے، اگرچہ تعداد کے لحاظ سے یہ اس وقت تین لاکھ سے زیادہ تھے جیسا کہ سموئیل میں تصریح ہے[۱] لیکن بدعات اور شرک کے غلبہ کی وجہ سے ان کی مذہبی و اخلاقی حالت بھی بڑی خراب تھی اور اجتماعی تنظیم مفقود ہونے کی وجہ سے سیاسی حالت بھی بڑی ابتر تھی۔ ہر طرف سے دشمنوں کی یورش تھی اور یہ ان سے اس قدر مرعوب اور دہشت زدہ تھے کہ کسی سے مقابلہ کی ہمت اپنے اندر نہیں پا رہے تھے۔ خاص طور پر فلسطیوں نے ان کو بری طرح مرعوب کر لیا تھا۔ انہوں نے ان پر چڑھائی کر کے ان کا قتل عام بھی کیا اور ان سے خدا کا وہ صندوق بھی چھین لے گئے جس کی حیثیت ان کے ہاں بالکل قبلہ کی تھی، جس کو وہ اپنی تمام عبادات اور تمام مہمات میں آگے آگے رکھتے تھے۔ ان کے ڈر سے بنی اسرائیل نے اپنے عقرون سے لے کر جات تک کے سارے شہر بھی خالی کر دیئے تھے[۲]۔ خوف و بزدلی کی یہ موت ان پر بیس برس طاری رہی[۳]۔ اس کے بعد سموئیل نبی نے ان کے اندر اصلاح و تجدید کا کام شروع کیا، ان کو شرک و بدعت سے توبہ کرنے اور اپنے انتشار کو دور کر کے از سر نو منظم و متحد ہونے کی دعوت دی۔ ان کی اس دعوت کو اللہ تعالیٰ نے کامیابی بخشی اور اس طرح بنی اسرائیل میں بیس سال کی مردنی کے بعد از سر نو ایمانی و سیاسی زندگی کی حرکت پیدا ہوئی اور وہ اس قابل ہوئے کہ فلسطیوں کے مقابل میں کھڑے ہو سکیں اور اپنے ان شہروں کو ان سے واپس لے سکیں جن کو خود خالی کر کے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

سموئیل میں یہ داستان بہت پھیلی ہوئی ہے۔ ہم اس کے کچھ ضروری حصے یہاں نقل کرتے ہیں جن سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے جو ہم نے اُوپر پیش کیا ہے۔

فلسطیوں سے بنی اسرائیل کی مرعوبیت، اُن کے ہاتھوں اِن کے قتل عام اور خدا کے صندوق کے چھن جانے کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

---

[۱] سموئیل باب ۱۱ آیت ۹۔ [۲] سموئیل باب ۱۴۔ [۳] سموئیل باب ۲۔

"اور فلستی لڑے اور بنی اسرائیل نے شکست کھائی اور ہر ایک اپنے ڈیرے کو بھاگا اور وہاں نہایت بڑی خونریزی ہوئی کیونکہ تیس ہزار اسرائیلی پیادے وہاں کھیت آئے اور خدا کا صندوق چھن گیا" سموئیل باب ۴ ۱۰-۱۱

خدا کے صندوق کے چھن جانے کا جو اثر بنی اسرائیل پر پڑا اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

"اس خبر لانے والے نے جواب دیا اسرائیلی فلستیوں کے آگے سے بھاگے اور لوگوں میں بڑی خونریزی ہوئی اور تیرے دونوں بیٹے حفنی اور فینحاس بھی مر گئے اور خدا کا صندوق چھن گیا۔ جب اس نے خدا کے صندوق کا ذکر کیا تو وہ کرسی پر سے پچھاڑ کھا کر پھاٹک کے کنارے گرا اور اس کی گردن ٹوٹ گئی۔ . . . .

. . . . اور کہنے لگی کہ حشمت اسرائیل سے جاتی رہی اس لئے کہ خدا کا صندوق چھن گیا تھا اور اس کا خسر اور خاوند جاتے رہے تھے سو اس نے کہا کہ حشمت اسرائیل سے جاتی رہی کیونکہ خدا کا صندوق چھن گیا ہے،، سموئیل باب ۴ ۱۷-۲۲

اس حادثہ کے بعد بنی اسرائیل پر پورے بیس سال تک خوف و بزدلی اور نوحہ و ماتم کی جو مردنی طاری رہی اور پھر سموئیل نبی نے ان کے اندر اصلاح و تجدید کی جو دعوت بلند کی اس کا ذکر اس طرح آتا ہے۔

"اور جس دن سے صندوق قریت یعریم میں رہا تب سے ایک مدت ہوگئی یعنی بیس برس گزرے اور اسرائیل کا سارا گھرانا خداوند کے پیچھے نوحہ کرتا رہا اور سموئیل نے اسرائیل کے سارے گھرانے سے کہا کہ اگر تم اپنے سارے دل سے خداوند کی طرف رجوع لاتے ہو تو اجنبی دیوتاؤں اور عستارات کو اپنے بیچ سے دور کرو اور خداوند کے لئے اپنے دلوں کو مستعد کر کے فقط اسی کی عبادت کرو اور وہ فلستیوں کے ہاتھ سے تمہیں رہائی دے گا۔ تب بنی اسرائیل نے بعلیم اور عستارات کو دُور کیا اور فقط خداوند کی عبادت کرنے لگے۔ پھر سموئیل نے کہا کہ سب اسرائیل کو مصفاہ میں جمع کرو اور میں تمہارے لئے خداوند سے دعا کروں گا،، سموئیل باب ۲-۶۔

اس اجتماعی توبہ و استغفار اور تنظیم و اتحاد کے بعد بنی اسرائیل اس قابل ہوئے کہ فلستیوں کے مقابل میں کھڑے ہو سکیں اور ان کو شکست دے کر ان سے اپنے چھنے ہوئے شہر اور ساتھ

ہی اپنی چھنی ہوئی حشمت واپس لے سکیں۔ بنی اسرائیل کی اس نئی زندگی کا ذکر اس طرح آتا ہے۔

"اور سموئیل بنی اسرائیل کے لئے خداوند کے حضور فریاد کرتا رہا اور خداوند نے اس کی سنی اور جس وقت سموئیل اس سوختنی قربانی کو گزران رہا تھا اس وقت فلستی اسرائیلیوں سے جنگ کرنے کو نزدیک آئے لیکن خداوند فلستیوں کے اوپر اسی دن بڑی کڑک کے ساتھ گرجا اور ان کو گھبرا دیا اور انہوں نے اسرائیلیوں کے آگے شکست کھائی اور اسرائیل کے لوگوں نے مصفاہ سے نکل کر فلستیوں کو رگیدا اور بیت کر کے نیچے تک انہیں مارتے چلے گئے ..... سو فلستی مغلوب ہوئے اور اسرائیل کی سرحد میں پھر نہ آئے اور سموئیل کی زندگی بھر خداوند کا ہاتھ فلستیوں کے خلاف رہا اور عقرون سے جات تک کے شہر جن کو فلستیوں نے اسرائیلیوں سے لے لیا تھا وہ پھر اسرائیلیوں کے قبضہ میں آئے اور اسرائیلیوں نے ان کی نواحی بھی فلستیوں کے ہاتھ سے چھڑا لی۔" سموئیل باب ۷-۱۰-۱۴

ہمارے نزدیک تاریخ بنی اسرائیل کا یہی جزو ہے جس کی طرف آیت زیر بحث میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ جب انہوں نے خوف اور بزدلی کی زندگی اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس ایمانی و اخلاقی موت کے حوالہ کر دیا جس کی تعبیر "موتوا" سے فرمائی ہے۔ یہ معاملہ ٹھیک ٹھیک اس سنت اللہ کے مطابق ہوا جس کی طرف فلما زاغوا ازاغ اللہ قلوبہم میں اشارہ کیا گیا ہے یعنی جب انہوں نے گمراہی پسند کی تو اللہ نے ان کو گمراہی میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا۔ پھر جب ان کے اندر تجدید و احیائے ملت کی دعوت اٹھی اور انہوں نے از سر نو ایمان و اسلام کی حیات تازہ اختیار کر لینے کا عزم کر لیا تو اللہ نے ان کو از سر نو زندہ و متحرک کر دیا اسی چیز کو یہاں "ثم احیاہم" کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ قوموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ اسی اصول پر ہے۔ اگر کوئی قوم اپنے لئے ذلت و نامرادی کو پسند کرتی ہے تو خدا اس کو ذلت و نامرادی کے حوالہ کر دیتا ہے اور اگر کوئی قوم عروج و سربلندی کی طالب ہوتی ہے اور اس طلب کے جو تقاضے ہیں ان کو پورا کرنے کی ہمت دکھاتی ہے تو اللہ اس کو عزت و سربلندی بخشتا ہے اور یہ مرتبہ دے کر اس کا امتحان کرتا ہے۔

واقعہ کے ذکر کا مقصد

اس واقعہ کے ذکر سے مقصود مسلمانوں خصوصاً کمزور مسلمانوں کو اللہ کی راہ میں جہاد و انفاق پر ابھارنا ہے۔ گویا یہ اس مضمون کی تمہید ہے جو آگے کی آیات میں بیان ہوا ہے۔ ہم تمہید والی فصل میں اشارہ کر آئے ہیں کہ بنی اسرائیل کا یہ واقعہ بھی ان کے قبلہ کی جنگ سے متعلق ہے اور مسلمانوں کو

بھی یہاں جس جنگ اور جس انفاق کے لئے ابھارا جا رہا ہے اس کا تعلق اصلاً قبلہ ہی کی آزادی سے ہے دونوں میں نہایت واضح قدر مشترک موجود ہے۔ گویا مسلمانوں کے سامنے بھی اس وقت زندگی اور موت دونوں کی راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ اگر وہ موت سے ڈر گئے تو یاد رکھیں کہ ان کو موت سے کوئی چیز بھی بچا نہ سکے گی، ان کے اوپر ذلت و خواری اور نفاق کی موت طاری ہو کر رہے گی اور اگر وہ موت سے بے پروا ہو کر زندگی کی راہ پر بڑھنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے تو اللہ ان کو دنیا میں ایمان و اسلام کی باعظمت زندگی اور آخرت میں فوز و فلاح کی حیات جاوداں سے سرفراز فرمائے گا۔

جہاد کے لئے دو محرک!

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۲۴۴ اُوپر کی تاریخی تمہید کے بعد یہ مسلمانوں کو جنگ پر ابھارا ہے۔ اور اس ابھارنے کے لئے دو محرک یہاں نمایاں فرمائے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ جنگ اللہ کی راہ میں ہے، نفس یا شیطان کی راہ میں نہیں ہے اس وجہ سے اس میں ہر قدم پر سنیے کو اللہ کی معیت حاصل ہے۔ دوسرا یہ کہ اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے، تمہاری جانبازیاں اور قربانیاں، تمہاری دعائیں اور فریادیں، تمہارے دشمنوں کی چالیں اور تدبیریں سب اس کے علم میں ہیں اس وجہ سے اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ

مر گئے ہم انہیں خبر نہ ہوئی

ظاہر ہے کہ ان صفات کا حوالہ دینے سے مقصود یہاں ان کا لازم ہے یعنی جب اللہ سنتا اور جانتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ تمہاری پکار پر تمہاری مدد و نصرت فرمائے گا اور تمہاری جانبازیوں کا تمہیں بھرپور صلہ دے گا۔

انفاق کے لئے قرض کی تعبیر

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ۭ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۠ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۲۴۵ جانی قربانی کی دعوت کے بعد یہ مالی قربانی کی دعوت ہے اور اس کے لئے جو اسلوب اختیار فرمایا ہے وہ غایت درجہ مؤثر ہے۔ اول تو سوال کا یہ انداز ہی کہ "کون ہے جو خدا کو قرض دینے کے لئے آگے بڑھتا ہے!" غایت درجہ شوق انگیز ہے، پھر یہاں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو "قرض دینے" سے تعبیر فرمایا ہے۔ قرض، قرضدار کے ذمہ واجب ہوتا ہے۔ اب یہ رب کریم کا کتنا بڑا احسان ہے کہ جو مال اس نے خود بندوں کو عنایت فرمایا ہے وہی مال وہ جب ان سے اپنی راہ میں خرچ کرنے کے لئے کہتا ہے تو اس کو اپنے

ذمہ قرض ٹھہرتا ہے یعنی اس کی واپسی از خود اپنے ذمہ واجب قرار دیتا ہے۔ پھر اس سے زیادہ روح و دل کو بے خود کر دینے والی بات یہ ارشاد ہوئی ہے کہ رب کریم یہ قرض اس لئے مانگتا ہے کہ وہ بندوں کے دیئے ہوئے خرف ریزوں کو خوب بڑھائے اور ان کو بڑھا کر ایک لازوال خزانہ کی شکل میں ان کو واپس کرے۔ یعنی اس قرض کی ضرورت اس لئے نہیں پیش آئی ہے کہ خدا کے خزانے میں کوئی کمی واقع ہو گئی ہے، اس کا خزانہ بھرپور اور وہ بالکل بے نیاز و بے پروا ہے، البتہ اس کی کریمی نے اپنے بندوں کے لئے نفع کمانے کی یہ راہ کھولی ہے کہ وہ اگر چاہیں تو ایک خرچ کر کے دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک اس کا اجر حاصل کر لیں۔

قرض حسن کا مفہوم

اس قرض کے متعلق شرط صرف ایک لگائی ہے۔ وہ یہ کہ یہ قرض "قرض حسن" ہو۔ قرض حسن کا مفہوم قرآن کے دوسرے مواقع سے جو نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ دل کی تنگی کے ساتھ محض چھدا اتارنے کے لئے نہ دیا جائے بلکہ پوری فراخدلی اور حوصلے کے ساتھ دیا جائے، ریا اور نمائش کے لئے نہ دیا جائے بلکہ صرف خدا کی خوشنودی کے لئے دیا جائے، کسی دنیوی طمع کے حصول کی غرض سامنے رکھ کر نہ دیا جائے بلکہ صرف آخرت کی اجر کی خاطر دیا جائے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ حقیر، کم وقعت اور ناجائز ذرائع سے حاصل کئے ہوئے مال میں سے نہ دیا جائے بلکہ محبوب، عزیز اور پاکیزہ کمائی میں سے دیا جائے۔ اسی سورہ میں آگے بھی ان باتوں کی وضاحت ہو گی اور احادیث میں بھی ان کی تفصیل موجود ہے۔

آخر میں اصل نکتے کی بات فرما دی کہ تنگی اور کشادگی کا انحصار آدمی کی اپنی تدبیروں پر نہیں ہے بلکہ یہ چیز خدا کے اختیار میں ہے اس وجہ سے اگر وہ اپنا مال خدا سے بچاتا اور چھپاتا ہے تو اس کے معنی ہوئے کہ وہ اسی سے چھپاتا ہے جس کے اختیار میں بخشنے کے بعد چھین لینا بھی ہے۔

"وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ" میں یہ پہلو بھی ہے کہ آج خدا سے منہ چھپانے والے اس بات کو نہ بھولیں کہ کل ان کو خدا کو منہ دکھانا بھی ہے۔ اور یہ پہلو بھی ہے کہ جس دنیا کی زندگی کے لئے یہ خدا سے بخالت کر رہے ہیں یہ زندگی تو چند روزہ ہے، اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے جس کے لئے اصلی فکر ہونی چاہیئے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰی اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَیْكُمُ

الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا قَالُوْا وَمَا لَنَا اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ بِالظّٰلِمِیْنَ ۲۴۶

"ملأ" کا اصل لغوی مفہوم بھرنا ہے۔ اپنے اسی مفہوم سے ترقی کر کے یہ لفظ کسی قوم کے اشراف واعیان اور اکابر وسادات کے لئے استعمال ہونے لگا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی ہو گی کہ قوم کے اعیان و اشراف ہی ہوتے ہیں جو اس کی چوپالوں، پنچایتوں، مجلسوں، کونسلوں اور اس کے درباروں کو پُر کرتے ہیں۔

لفظ "ملأ" کی تحقیق

"ملک" کے معنی صاحب اختیار واقتدار کے ہیں۔ یہ اختیار واقتدار مطلق قسم کا بھی ہو سکتا ہے جس طرح کا اختیار واقتدار کسی جبار ومطلق العنان بادشاہ کو حاصل ہوتا ہے اور محدود ومقید قسم کا بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ ایک پابند آئین وقانون یا پابند شریعت بادشاہ کو یا کسی امیر لشکر یا سپہ سالار کو حاصل ہوتا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں موقع دلیل ہے کہ یہ دوسرے مفہوم میں استعمال ہوا ہے اس لئے کہ اس کے تقرر کے لئے بنی اسرائیل کے اعیان نے درخواست اس زمانے کے نبی (سموئیل) سے کی اور انہی کے تقرر سے اس کا تقرر ہوا اور توریت کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہی کی ہدایات کے تحت اور انہی کی دعاؤں کے زیر اثر وہ اپنے سارے فرائض انجام دیتا تھا۔ قرآن نے یہ لفظ مدح وذم دونوں کے محل میں استعمال کیا ہے۔ ایک بادشاہ وہ بھی تھا جس نے حضرت ابراہیمؑ سے حجت کی اور جس نے زندگی اور موت دونوں پر اختیار کا دعویٰ کیا۔ قرآن نے اس کی مذمت کی۔ اس کے برعکس ذوالقرنین، حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ بھی بادشاہ ہیں لیکن قرآن نے ان کی تعریف فرمائی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے نزدیک سیاسی نظام میں اصل اہمیت اس کی صورت کی نہیں بلکہ اس کی روح کی ہے۔ اگر اس کی روح خدا اور اس کے رسول کے قانون کے تابع ہے تو وہ قابل ستائش ہے، اس کی شکل کچھ بھی ہو۔ اگر روح خدا اور رسول کی باغی ہے تو وہ قابل مذمت ہے عام اس سے کہ وہ ملوکیت ہو یا جمہوریت۔

"ملک" کا مفہوم

جس طرح اُوپر کی آیات میں بنی اسرائیل کی ایمانی واخلاقی موت وحیات کے ایک واقعہ کی طرف اشارہ کر کے مسلمانوں کو زندگی کی راہ اختیار کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ یہ زندگی خدا کی راہ

اس آیت کی تعلیم اور واقعہ کی نوعیت

۱؎ سموئیل باب ۲۵

میں جان اور مال کی قربانی سے حاصل ہوتی ہے، اسی طرح اس آیت میں اور آگے کی چند آیات میں تاریخ بنی اسرائیل کے اسی سلسلے کے بعض واقعات کی طرف اشارہ کر کے مسلمانوں کو اجتماعی و سیاسی زندگی سے متعلق بعض نہایت اہم سبق دیئے گئے ہیں۔

زیر بحث آیت میں جس واقعے کی طرف اشارہ ہے اس کی تفصیل تورات کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ سموئیل نبی[۵۱] نے بنی اسرائیل کے اندر تجدید و اصلاح اور ان کی تنظیم کا جو کام شروع کیا اس سے بنی اسرائیل کے اندر کچھ زندگی تو پیدا ہوئی اور وہ فلستیوں کے مقابل میں کھڑے ہونے اور ان سے اپنے بعض چھنے ہوئے شہر واپس لینے میں کامیاب ہوئے لیکن بنی اسرائیل ہر طرف سے دشمنوں سے گھرے ہوئے تھے، ان کے بہت سے شہر اب بھی مخالفوں کے قبضے میں تھے، فلستیوں کے علاوہ موآب، بنی عمون، ادوم اور صوبا کے بادشاہوں سے بھی ہر وقت ان کو خطرہ تھا، پھر سموئیل نبی بوڑھے ہو چکے تھے اور انہوں نے بنی اسرائیل کی قیادت و تنظیم کی جو ذمہ داریاں اپنے بیٹوں کے سپرد کی تھیں وہ ان کو بنی اسرائیل کی توقع کے مطابق نہیں نباہ رہے تھے اس وجہ سے انہوں نے سموئیل سے یہ درخواست کی کہ وہ ان کی قیادت کے لئے کسی امیر کو مامور کریں تاکہ وہ اس کی سربراہی میں جہاد کر سکیں اور اپنے دشمنوں سے انتقام لے سکیں[۵۲]۔

سموئیل اپنے تجربات کی بنا پر جانتے تھے کہ بنی اسرائیل کی اصلی کمزوری یہ نہیں ہے کہ میدان جنگ میں رہنمائی کرنے والا ان کے پاس کوئی لیڈر نہیں ہے بلکہ ان کی اصلی کمزوری یہ ہے کہ جنگ کے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے ان کے اندر عزم و ایمان نہیں ہے اس وجہ سے انہوں نے، جیسا کہ تورات سے واضح ہوتا ہے، ان کے اس مطالبہ کی مخالفت کی اور ان کی اصلی کمزوری کی طرف توجہ دلائی کہ ایسا نہیں ہوگا کہ جہاد بھی فرض ہو جائے اور امیر بھی مقرر ہو جائے لیکن پھر تم جہاد سے انکار کر دو۔ اس پر انہوں نے بڑے جوش و جذبے کا اظہار کیا کہ ہم اپنے گھروں اور اپنے بیوی بچوں سے نکالے گئے ہیں، اگر اب بھی ہم جنگ نہ کریں گے تو پھر کب کریں گے؟ لیکن سموئیل کا اندازہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔ انہوں نے تو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق ان کی قیادت کے لئے امیر بھی مقرر کر دیا اور جہاد کا حکم بھی دے دیا لیکن بنی اسرائیل

---

۵۱ ان کا زمانہ ۸۸۹ قبل مسیح کا زمانہ ہے۔

۵۲ ملاحظہ ہو سموئیل باب ۸

نے حسب عادت عین وقت پر کندھا ڈال دیا۔ آگے کی تفصیلات سے معلوم ہوگا کہ اول تو انہیں منتخب سردار کی سرداری ہی پر اعتراض ہوا، پھر جب بادلِ ناخواستہ اس کی فوج میں بھرتی ہوئے بھی تو پہلے ہی امتحان میں پھسڈی ثابت ہوئے۔

"وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ بِالظّٰلِمِیْنَ" (اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے) سے مراد اس کا لازمی نتیجہ ہے یعنی جب خدا خوب جانتا ہے تو ان کے ساتھ معاملہ بھی اپنے علم کے مطابق ہی کرے گا۔

قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ، قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ، قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ، وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ، وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۴۷

"بعث" کے معنی اٹھانے، ابھارنے، بھیجنے کے ہیں پھر اسی مفہوم سے اس کے اندر مامور کرنے کا مفہوم پیدا ہوگیا۔ چونکہ اس سالار کا انتخاب سموئیل نے خدا کی ہدایت کے مطابق کیا تھا جیسا کہ تورات سے بھی ثابت ہے اور قرآن کے الفاظ "اَصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ" سے بھی واضح ہے اس وجہ سے اس کے لئے "بعث" کا لفظ استعمال ہوا۔

"طالوت" یہ اس مامور سالار کا نام ہے۔ تورات میں ان کا نام ساؤل آیا ہے۔ اور ان کے غیر معمولی طور پر قدآور ہونے کا ذکر خاص طور پر ہوا ہے۔ "اور جب وہ لوگوں کے درمیان کھڑا ہوا تو ایسا قدآور تھا کہ لوگ اس کے کندھے تک آتے تھے[1]"، کچھ بعید نہیں کہ اپنے اس غیر معمولی قد و قامت کی وجہ سے وہ لوگوں میں اس لقب سے بھی مشہور رہے ہوں۔ طالوت کے معنی "لمبے تڑنگے" کے ہیں۔ عربی اور عبرانی دونوں زبانیں قریب قریب ہیں اس وجہ سے دونوں میں بہت سے مادے مشترک ہیں گمان ہوتا ہے کہ تورات نے ان کا ذکر نام سے کیا ہے اور قرآن نے لقب سے۔ ورنہ پھر یہ ماننا پڑے گا کہ ان کے نام کے بارے میں تورات کا بیان غلط ہے، اصل نام طالوت ہی ہے۔ قرآن نے یہاں بعض دوسرے واقعات کے بارے میں بھی تورات کے بیانات کی تردید کی ہے۔ آگے ہم ان کی طرف اشارہ کریں گے اور یہ بھی واضح کریں گے کہ اس طرح کے اختلافات کی صورت میں قرآن کا بیان کیوں قابل ترجیح ہے۔

---

[1] سموئیل باب ۲۴۔

طالوت کا انتخاب اور اس پر بنی اسرائیل کا اعتراض

بنی اسرائیل کے اپنے مطالبے پر جب سموئیل نے ایک سالار کا انتخاب کیا اور اس کو ان کے سامنے پیش کیا تو بجائے اس کے کہ خوشی سے اس کو قبول کرتے انہوں نے حسب عادت اس انتخاب پر اعتراض کر دیا کہ بھلا یہ ہمارا سردار کیسے ہو سکتا ہے، اس سے زیادہ حق دار تو ہم اس منصب کے ہیں؟ اعتراض کی بنیاد یہ تھی کہ طالوت کوئی مالدار آدمی نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں طالوت بنیامین کے قبیلہ سے تھے بنیامین کا قبیلہ اول تو بنی اسرائیل کے تمام قبیلوں میں سب سے چھوٹا قبیلہ تھا۔ پھر طالوت اس قبیلہ کے تمام گھرانوں میں سب سے چھوٹے گھرانے سے تھے۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ طالوت کو اپنے قبیلے کی کمزوری کا خود بھی احساس تھا۔ چنانچہ جب سموئیل نے ان کے انتخاب کا ان سے ذکر کیا تو انہوں نے بڑی خاکساری کے ساتھ یہ الفاظ کہے۔

> ساؤل نے جواب دیا کیا میں بنیمینی یعنی اسرائیل کے سب سے چھوٹے قبیلہ کا نہیں؟ اور کیا میرا گھرانا بنیمین کے قبیلہ کے سب گھرانوں میں سب سے چھوٹا نہیں؟[۵۱]

ظاہر ہے کہ مالی اور عددی دونوں ہی اعتبار سے ایک کمزور آدمی کو بنی اسرائیل کے وہ قبیلے کس طرح خاطر میں لا سکتے تھے جن کو اپنی مضبوط عصبیت اور اپنی مالی برتری کا گھمنڈ تھا چنانچہ انہوں نے اس انتخاب پر اعتراض کیا۔ تورات میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

> "پر شریروں میں سے بعض کہنے لگے کہ یہ شخص ہم کو کس طرح بچائے گا، سو انہوں نے اس کی تحقیر کی اور اس کے لئے نذرانے نہ لائے پر وہ ان سنی کر گیا[۵۲]"
>
> "اور لوگ سموئیل سے کہنے لگے کس نے یہ کہا تھا کہ کیا ساؤل ہم پر حکومت کرے گا؟"[۵۳]

اس اعتراض کا جواب سموئیل نبی نے یہ دیا کہ یہ انتخاب خدا کا انتخاب ہے۔ اسی نے اس کو تمہاری سرداری کے لئے چنا ہے۔ تم سرداری کو تعداد اور مال کے پیمانوں سے تولتے اور ناپتے ہو لیکن خدا علم اور عمل کے پیمانے سے ناپتا ہے۔ طالوت کے پاس اگرچہ خاندان کی شوکت اور مال کی فراوانی نہیں ہے لیکن علم کی وسعت اور عمل کی قوتوں سے وہ بھرپور ہے اور خدا کے انتخاب میں

---

[۵۱] سموئیل باب ۹ ۲۱ [۵۲] سموئیل باب ۱۰ ۲۷ [۵۳] سموئیل باب ۱۱ ۱۲

اصلی اہمیت انہی چیزوں کو حاصل ہے نہ کہ خاندان اور مال کو۔

اس کے بعد فرمایا کہ اقتدار و اختیار خدا کی دین ہے وہ جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے اور جس کو بخشتا ہے اپنی حکمت کے تقاضوں کے تحت بخشتا ہے۔ اس کا اقتدار تمام اقتداروں کو محیط اور اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ اس کے پاس نہ بخشنے کے لئے کمی ہے، نہ بخش کر واپس لینے میں کوئی مانع ہے، نہ کسی معاملے کے ظاہر و باطن یا اس کے ماضی و مستقبل کا کوئی گوشہ اس سے مخفی ہے۔

"وَاسِعٌ عَلِيمٌ" میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ تم ہر معاملے کو اپنی تنگ اور محدود نگاہوں سے دیکھتے ہو لیکن خدا اپنے فیصلے اپنی قدرت اور اپنے علم کی روشنی میں صادر فرماتا ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۲۴۸

"تابوت" کے معنی صندوق کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد بنی اسرائیل کا وہ صندوق ہے جس کو تورات میں "خدا کا صندوق" یا "خدا کے عہد کا صندوق" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل کے مصر سے خروج کے زمانے سے لے کر بیت المقدس کی تعمیر تک اسی صندوق کو بنی اسرائیل کے قبلہ کی حیثیت حاصل رہی۔ وہ اس کو اپنے خیمہ عبادت میں ایک مخصوص مقام پر نہایت مخصوص اہتمام کے ساتھ پردوں کے بیچ میں رکھتے اور تمام دعا و عبادت میں اسی کی طرف متوجہ ہوتے۔ ان کے ربی اور کاہن غیبی رہنمائی کے لئے بھی اسی کو مرجع بناتے۔ مشکل حالات، قومی مصائب اور جنگ کے میدانوں میں بھی بنی اسرائیل کا حوصلہ قائم رکھنے میں اس صندوق کو سب سے بڑے عامل کی حیثیت حاصل رہی۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانے تک تو اس میں تورات اور صحرا کی زندگی کے دور کی بعض یادگاریں محفوظ کی گئیں لیکن پھر اس میں حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ اور ان کے خاندان کے بعض اور تبرکات بھی محفوظ کر دیئے گئے۔

تابوت کی حقیقت

"سَكِينَة" کے معنی اطمینان، قرار اور حوصلہ کے ہیں، بالخصوص وہ اطمینان و حوصلہ جو پرخطر حالات اور جنگ کے مصایب میں آدمی کے عزم کو قائم رکھے۔ مثلاً هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا ۴۔ الفتح (وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں عزم و اطمینان اتارا تاکہ وہ اپنے ایمان میں اضافہ کریں) فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا ۱۸۔ فتح (تو ان

سکینہ کی حقیقت

تابوت کی بنی اسرائیل میں واپسی

کے دلوں میں جو کمزوری تھی اللہ نے اس کو جان لیا پس ان پر عزم و اطمینان آتارا اور ایک فوری فتح سے ان کو نوازا۔) اس تابوت کے ساتھ بنی اسرائیل کو جو والہانہ عقیدت تھی اس کا ایک خاص پہلو، جیسا کہ ہم نے اُوپر اشارہ کیا، یہ بھی تھا کہ مصائب و مشکلات اور میدان جنگ میں ان کے حوصلے (morale) کو قائم رکھنے میں اس کو سب سے زیادہ دخل تھا۔ فِیْهِ سَكِیْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ سے اس کے اسی خاص پہلو کی طرف اشارہ ہے۔

اُدپر فلسطیوں کے ہاتھوں اس تابوت کے چھنے جانے کا ذکر ہم کر چکے ہیں اور یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ اس کے چھن جانے کو بنی اسرائیل کے بزرگوں نے اسرائیل سے ساری حشمت کے چھن جانے سے تعبیر کیا اور ساری قوم نے اس عظیم حادثے پر ماتم کیا۔ چنانچہ اس دور میں بنی اسرائیل کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اس تابوت کو اپنے دشمنوں سے واپس لینے کا تھا۔ اسی بنا پر سموئیل نے طالوت کے انتخاب کے خدائی انتخاب ہونے کی یہ نشانی ٹھہرائی کہ اس کے بعد تابوت تمہارے پاس فرشتوں کی مدد سے آپ سے آپ آجائے گا۔ چنانچہ ان کی یہ پیشینگوئی پوری ہوئی اور فلسطیوں نے اس صندوق کو ایک گاڑی پر رکھ کر اس کو بنی اسرائیل کے علاقے کی طرف ہانک دیا۔ سموئیل میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

اب تم ایک نئی گاڑی بناؤ اور دو دودھ والی گائیں جن کے جوا نہ لگا ہو لو۔ اور ان گایوں کو گاڑی میں جوتو اور ان کے بچوں کو گھر لوٹا لاؤ اور خداوند کا صندوق لے کر اس گاڑی پر رکھو اور سونے کی چیزوں کو جن کو تم جرم کی قربانی کے طور پر ساتھ کر دگے ایک صندوقچہ میں کر کے اس کے پہلو میں رکھ دو اور اسے روانہ کر دو کہ چلا جائے اور دیکھتے رہنا.....

.... سو ان لوگوں نے ایسا ہی کیا اور دو دودھ والی گائیں لے کر ان کو گاڑی میں جوتا اور ان کے بچوں کو گھر میں بند کر دیا اور خداوند کے صندوق ....

اور صندوقچہ کو گاڑی پر رکھ دیا۔ ان گایوں نے بیت شمس کا سیدھا راستہ لیا۔ وہ سڑک ہی سڑک ڈکارتی گئیں اور دہنے یا بائیں ہاتھ نہ مڑیں اور فلستی سردار بیت شمس کی سرحد تک ان کے ساتھ گئے اور بیت شمس کے لوگ وادی میں گیہوں کی فصل کاٹ رہے تھے انہوں نے جو آنکھیں اُٹھائیں تو صندوق کو دیکھا اور دیکھتے ہی خوش ہو گئے۔

سموئیل باب ۶۔ ۱۳

تابوت کی گاڑی کا بغیر کسی گاڑیبان اور بغیر کسی محافظ کے اور وہ بھی دو ایسی گایوں کے ذریعے سے جن کے دودھ پیتے بچے گھروں پر روک لئے گئے تھے اس طرح بغیر دہنے بائیں مڑے ٹھیک منزل پر پہنچ جانا ایک ایسا واقعہ ہے جو کہ رویوں کی رہنمائی اور فرشتوں کی مدد ہی سے ہو سکتا ہے اسی چیز کو "تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ" کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

تابوت کی واپسی سے متعلق تورات اور قرآن کے بیان میں بڑا فرق ہے۔ قرآن کی زیر بحث آیت سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کی واپسی کا واقعہ اس وقت پیش آیا ہے جب طالوت کا خدا کے مقرر کردہ بادشاہ کی حیثیت سے اعلان ہوا ہے اور یہ واقعہ گویا ایک نشان تھا اس بات کا کہ طالوت کا انتخاب من جانب اللہ ہے، سموئیل نے خدا کے حکم سے ان کو مسح کر کے برکت دی ہے اور ان کا تقرر بنی اسرائیل میں ایک نئے دور خیر و برکت اور ایک جدید تاریخ کامیابی و فتحمندی کا آغاز ہے۔

اس کے بالکل برعکس تورات کا بیان یہ ہے کہ اس سے بہت پہلے ہی تابوت کو ایک گاڑی پر رکھ کر، جیسا کہ اوپر کے حوالے میں تصریح ہے، فلسطیوں نے گاڑی بنی اسرائیل کے علاقہ کی طرف ہانک دی تھی اور تابوت پوری حفاظت کے ساتھ ان کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس طرح واپس کرنے کی وجہ تورات میں یہ بیان ہوئی ہے کہ فلسطینی تابوت چھین لے جانے کو تو چھین لے گئے لیکن وہ ان کے لئے مصیبت بن گیا، انہوں نے اس کو جہاں جہاں رکھا وہاں مختلف قسم کی وبائیں پھوٹ پڑیں جس سے ان کے ہزاروں آدمی مر گئے بالآخر اس سے تنگ آکر انہوں نے سات ماہ کے بعد اپنے نجومیوں کے مشورے سے اس سے نجات حاصل کرنے کی وہ تدبیر اختیار کی جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا۔

تابوت کی واپسی سے متعلق تورات اور قرآن کے بیان کا اختلاف

اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں بیانوں میں سے کون سا بیان روایت اور درایت کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے؟ ہمارے نزدیک مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر قرآن کا بیان صحیح اور تورات کا بیان غلط ہے۔

قرآن کے بیان کے صحیح ہونے کی وجوہ

پہلی وجہ یہ ہے کہ ان واقعات کے بیان کے خاتمہ پر قرآن نے یہ کہا ہے کہ تِلْكَ آيَاتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۲۵۲ بقرہ۔ (یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمہیں حق کے ساتھ سنا رہے ہیں اور بے شک تم اللہ کے رسولوں میں سے ہو) اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ امر یہاں قرآن کے پیش نظر ہے کہ یہ واقعہ جس شکل میں وہ پیش کر رہا ہے وہ تورات کے بیان سے مختلف ہے لیکن

واقعہ کی صحیح شکل وہی ہے جس شکل میں اس کو قرآن پیش کر رہا ہے نہ کہ جس شکل میں اس کو تورات پیش کر رہی ہے اور پھر اس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی ایک دلیل قرار دیا ہے کہ قدیم آسمانی صحیفوں کی جن سرگزشتوں کے جاننے کا تمہارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ان کو اس صحت کے ساتھ پیش کرنا کہ یہ سرگزشتیں محض بے مقصد داستان سرائی کے بجائے اپنے منطقی ربط و تسلسل اور اپنے حکیمانہ ثمرات و نتائج کے ساتھ لوگوں کے سامنے آئیں بغیر اس کے ممکن نہیں ہوا کہ اللہ نے تم کو اپنا رسول بنایا اور ان باتوں سے تمہیں اپنی وحی کے ذریعہ سے آگاہ فرمایا۔

ایک ہٹ دھرم یہ کہہ سکتا ہے کہ ان واقعات کے پیش کرنے میں قرآن کا بیان تورات کے بیان سے مختلف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تورات کا براہ راست کوئی علم نہیں تھا، وہ نعوذ باللہ سنی سنائی باتیں پیش کرتے تھے اس وجہ سے ان کا بیان تورات سے مختلف ہوتا تھا۔ لیکن یہ کہنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔ اول تو جو سنی سنائی بات کہتا ہے اس کی بات عام اور مشہور روایت کے مطابق ہوتی ہے، نہ کہ اس سے بالکل مختلف، دوسرے یہ کہ جو شخص سنی سنائی بات نقل کرتا ہے وہ کبھی پورے جزم و یقین کے ساتھ یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ فلاں بات جو تم کہہ رہے ہو یوں نہیں بلکہ یوں ہے۔ یہ انداز تو وہی اختیار کرتا ہے اور وہی اختیار کر سکتا ہے جو پورے علم و بصیرت کے ساتھ ایک بات کو جانتا ہو اور چیلنج دے کر اس پر تنقید یا اس کی تصحیح کرنا چاہتا ہو۔ یہاں صاف نظر آتا ہے کہ صورت معاملہ یہی ہے۔ قرآن نے ساؤل کے نام کی بھی تصحیح کی، تابوت کی واپسی کے واقعہ کو بھی اس کے اصلی رنگ میں پیش کیا اور آگے آپ دیکھیں گے کہ نہر والے امتحان کے صحیح موقع و محل کو بھی معین کیا اور پھر کہا کہ حق یہ ہے جو قرآن میں بیان ہو رہا ہے نہ کہ وہ جو تورات میں بیان ہوا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ عقل اور منطق کی رو سے بھی وہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے۔ تورات سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تابوت کی واپسی تمام تر نتیجہ تھی ان کرامات کا جو خود تابوت سے ظاہر ہوئیں۔ فلسطینی اس کے لے جانے کے بعد سے برابر آفات و مصائب کے ہدف بن گئے انہوں نے ان آفات سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے بہتری اسی میں دیکھی کہ یہ جن کی چیز ہے ان کے حوالہ کریں چنانچہ انہوں نے اپنی جان چھڑانے کی وہ شکل اختیار کی جو اوپر بیان ہوئی۔ بنی اسرائیل جیسی ضعیف الاعتقاد اور کرامات پرست قوم کے ذہن سے یہ بات چونکہ بہت قریب تھی اس وجہ سے انہوں نے

اس کو گھڑ بھی لیا اور پھر اس عوام پسند روایت کو تورات میں داخل بھی کر دیا لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا اتنے بڑے بڑے واقعات کسی قوم کی زندگی میں محض بچوں کے کھیل کی طرح ہو جایا کرتے ہیں؟ تابوت کی حیثیت بنی اسرائیل کے قبلہ کی تھی، نہ اس کا چھن جانا کوئی اتفاقی حادثہ ہو سکتا نہ اس کا واپس ہونا کوئی معمولی واقعہ ہو سکتا۔ اس طرح کا حادثہ پیش آیا تو اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ بنی اسرائیل اس وقت ایسی عملی و اعتقادی گمراہیوں میں مبتلا ہوئے ہوں جس کے سبب سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ اس سزا کے مستحق قرار پائے ہوں۔ اور اگر وہ اس کے واپس لینے میں کامیاب ہوئے تو اس کی راہ بھی اس طرح کھلی ہوگی کہ انہوں نے اپنے حالات و معاملات کی ایسی اصلاح کی ہو کہ خدا کی رحمت ان کی طرف متوجہ ہوئی ہو اور ان کے دشمن ان سے مرعوب ہوئے ہوں۔

تورات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں قبلہ کے چھن جانے کا واقعہ پیش آیا ہے اس زمانے میں بنی اسرائیل اعتقادی و عملی اعتبار سے بھی بالکل تباہ حال تھے اور سیاسی اعتبار سے بھی سخت پراگندگی اور انتشار میں مبتلا تھے۔ ہم اوپر اس کے ثبوت میں بعض حوالے نقل کر آئے ہیں۔ سموئیل نے ان حالات کی اصلاح کی کوشش کی اور اس کوشش میں ان کو ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کا انتشار اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ بڑھاپے میں ان کے لئے تنہا اس پر قابو پانا سخت مشکل تھا۔ لیکن طالوت کے تقرر کے بعد سے حالات میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔ سموئیل اور طالوت دونوں نے مل کر بنی اسرائیل کے اندر ایک تازہ امنگ پیدا کر دی۔ طالوت کے تقرر کے موقع پر سموئیل نے جو تقریر بنی اسرائیل کی پوری قوم کے سامنے کی ہم اس کا کچھ حصہ یہاں نقل کرتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکے گا کہ طالوت کے تقرر سے پہلے کے حالات کیا تھے اور بعد میں کن حالات کے پیدا ہونے کی امید بندھی۔

"پھر سموئیل لوگوں سے کہنے لگا وہ خداوند ہی ہے جس نے موسیٰ و ہارون کو مقرر کیا اور تمہارے باپ دادا کو ملک مصر سے نکال لایا سو اب ٹھہرے رہو تاکہ میں خداوند کے حضور ان سب نیکیوں کے بارے میں جو خداوند نے تم سے اور تمہارے باپ دادا سے کیں گفتگو کروں جب یعقوب مصر میں گیا اور تمہارے باپ دادا نے خداوند سے فریاد کی تو خداوند نے موسیٰ اور ہارون کو بھیجا جنہوں نے تمہارے باپ دادا کو نکال کر اس جگہ بسایا پر وہ خداوند خدا کو بھول گئے سو اس نے حضور کی فوج کے سپہ سالار سیسرا کے ہاتھ اور فلستیوں کے ہاتھ اور شاہ موآب

کے ہاتھ بیچ ڈالا اور وہ ان سے لڑے۔ پھر انہوں نے خداوند سے فریاد کی اور کہا کہ ہم نے گناہ کیا اس لئے کہ ہم نے خداوند کو چھوڑا اور بعلیم اور عستارات کی پرستش کی پر اب تو ہم کو ہمارے دشمنوں کے ہاتھ سے چھڑا تو ہم تیری پرستش کریں گے سو خداوند نے یرُبعل اور بدان اور افتاح اور سموئیل کو بھیجا اور تم کو تمہارے دشمنوں کے ہاتھ سے جو تمہاری چاروں طرف تھے رہائی دی اور تم چین سے رہنے لگے اور جب تم نے دیکھا کہ بنی عمون کا بادشاہ ناحس تم پر چڑھ آیا تو تم نے مجھ سے کہا کہ ہم پر کوئی بادشاہ سلطنت کرے حالانکہ خداوند تمہارا بادشاہ تھا۔ سو اب اس بادشاہ کو دیکھو جسے تم نے چن لیا اور جس کے لئے تم نے درخواست کی تھی دیکھو خداوند نے تم پر بادشاہ مقرر کر دیا ہے۔ اگر تم خداوند سے ڈرتے اس کی پرستش کرتے اور اس کی بات مانتے رہو اور خداوند کے حکم سے سرکشی نہ کرو اور تم اور وہ بادشاہ بھی جو تم پر سلطنت کرتا ہے خداوند اپنے خدا کے پیرو بنے رہو تو خیر۔ پر تم اگر تم خداوند کی بات نہ مانو بلکہ خداوند کے حکم سے سرکشی کرو تو خداوند کا ہاتھ تمہارے خلاف ہوگا جیسے وہ تمہارے باپ دادا کے خلاف ہوتا تھا۔ سو اب ٹھہرے رہو اس بڑے کام کو دیکھو جسے خداوند تمہاری آنکھوں کے سامنے کرے گا"

سموئیل باب ۱۲ ۶-۱۶

ایک طرف سموئیل نبی کی یہ اصلاحی سرگرمیاں تھیں، دوسری طرف طالوت نے اپنی خداداد صلاحیتوں کے ساتھ قوم کی تنظیم اور ان کے اندر روح جہاد پیدا کرنے کا کام پورے جوش و خروش کے ساتھ شروع کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے عمونیوں کے مقابلے کے لئے بنی اسرائیل کے مردوں کی مردم شماری کرائی تو معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل تین لاکھ اور یہوداہ کے مرد تیس ہزار ہیں۔ پھر عمونیوں پر اس زور کا حملہ کیا کہ وہ بالکل تتر بتر ہو گئے۔ اور دوستوں دشمنوں دونوں پر ان کی دھاک بیٹھ گئی۔ یہ حالات بلاشبہ ان کے مخالفوں کے لئے مرعوب کن ثابت ہوئے ہوں گے اور اس مرعوبیت کی وجہ سے فلسطیوں نے یہ مناسب سمجھا ہوگا کہ تابوت کو واپس کر کے ایک خوفناک جنگ کے خطرے سے اپنے کو بچا لے جائیں۔ بلاشبہ یہ واقعہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک ایسا واقعہ تھا جو طالوت کی اقبال مندی اور ان کے مؤید من اللہ بادشاہ ہونے کا نشان ہو سکتا تھا۔ چنانچہ

قرآن نے یہی کہا ہے اور یہ بات ہر اعتبار سے قرین عقل و قیاس معلوم ہوتی ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ تورات کے اس بیان کی خود تورات ہی کے بیانات سے تردید ہوتی ہے اگر واقعہ یہی ہے کہ فلسطیوں نے سات مہینے کے بعد ہی تابوت کو اس کی کرامات اور اس کے خوارق سے ڈر کر واپس کر دیا تھا تو تورات کے اس بیان کا کیا مطلب ہے۔

" اور جس دن سے صندوق قریت یعریم میں رہا تب سے ایک مدت ہو گئی یعنی بیس برس گزرے اور اسرائیل کا سارا گھرانا خداوند کے پیچھے نوحہ کرتا رہا۔"

سموئیل باب ۱

سوال یہ ہے کہ قریت یعریم اگر بنی اسرائیل ہی کے علاقہ میں شامل تھا اور تابوت انہی کی حفاظت میں تھا تو بیس برس تک اسرائیل کا سارا گھرانا خداوند کے پیچھے نوحہ کیوں کرتا رہا؟ اور اس "خداوند کے پیچھے" کے الفاظ کا کیا مطلب ہے؟

اصل یہ ہے کہ سموئیل میں یہود نے متضاد روایات کا اتنا انبار لگا دیا ہے کہ اس کے اندر حق و باطل کا امتیاز ناممکن ہے۔ یہ قرآن کا احسان ہے کہ اس نے بعض واقعات کے صحیح پہلو نمایاں کیے۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ، فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهٖ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ ۲۴۹

"فصل فصولاً" کے معنی کہیں سے چلنے، نکلنے اور روانہ ہونے کے ہیں۔ یعنی طالوت اپنی فوجیں لے کر مہم پر روانہ ہوئے۔ تورات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مہم فلسطینیوں کے مقابلہ کے لئے تھی جن کا سردار جاتی جولیت تھا، جس کا ذکر قرآن نے جالوت کے نام سے کیا ہے۔ اس جنگ میں طالوت اور جالوت کی فوجوں کے ایک دوسرے کے بالمقابل فوج آرائی کی جو شکل بیان ہوئی ہے وہ بالکل اس شکل سے ملتی ہے جو ہمارے ہاں بدر کے موقع پر کفار اور مسلمانوں کے مابین پیش آئی۔

جنگ بدر کی تصویر قدیم صحیفوں میں

سموئیل میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

"پھر فلستیوں نے جنگ کے لئے اپنی فوجیں جمع کیں اور یہوداہ کے شہر شوکہ میں فراہم ہوئے اور شوکہ اور عزیقہ کے درمیان افسدمیم میں خیمہ زن ہوئے اور ساول اور اسرائیل کے لوگوں نے جمع ہو کر ایلہ کی وادی میں ڈیرے ڈالے اور لڑائی کے لئے فلستیوں کے مقابل صف آرائی کی اور ایک طرف کے پہاڑ پر فلستی اور دوسری طرف کے پہاڑ پر بنی اسرائیل کھڑے ہوئے اور ان دونوں کے درمیان وادی تھی"

سموئیل باب ۱۷ ۱ - ۳

اس نقشہ پر غور کیجئے اور پھر ایک نظر اس نقشہ پر ڈالئے جو سورۂ انفال میں بدر کے موقع پر کفار اور مسلمانوں کے آمنے سامنے ہونے کا بیان ہوا ہے تو صاف نظر آئے گا کہ یہ بالکل جنگ بدر کی تصویر ہے۔ تحویل قبلہ کے بعد پہلی جنگ جو کم و بیش دو مہینوں کے بعد پیش آئی ہے وہ یہی بدر کی جنگ ہے۔ اس طرح گویا جنگ بدر کے پیش آنے سے پہلے اس کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے طالوت کی جنگ میں مسلمانوں کو دکھا دیا تھا۔ ہم سورہ انفال میں یہ واضح کریں گے کہ یہود بدر کا نقشہ دیکھ کر اس حقیقت کو تاڑ گئے تھے لیکن انہوں نے مشرکین کو برانگیختہ کرنے کے معاملہ میں بالکل شیطان کی روش اختیار کی۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ اس جنگ میں طالوت کے ساتھیوں کی تعداد بھی کم و بیش اتنی ہی تھی جتنی بدر میں حضورؐ کے ساتھیوں کی تھی۔

فوج کی اطاعت کا امتحان

"اِنَّ اللّٰہَ مُبْتَلِیْکُمْ بِنَہَرٍ" دشمن کے آمنے سامنے ہونے سے پہلے طالوت نے اپنی فوج کے ڈسپلن اور ان کی اطاعت و وفاداری کا امتحان لینے کے لئے یہ اعلان کیا کہ سامنے جو فلاں ندی ہماری راہ میں آ رہی ہے اس کے ذریعہ سے اللہ تمہاری جانچ کرے گا، تم میں سے جو اس کا پانی پی لے گا وہ میرا ساتھی نہ بن سکے گا، جو اس کو بالکل نہ پیئے گا وہ میرا ساتھی ہوگا۔ اگر کسی نے ہاتھ سے ایک آدھ چلو پی لیا تو وہ قابل درگزر ہے۔ اس امتحان میں فوج کی اکثریت فیل ہو گئی۔ لوگوں نے خوب سیر ہو کر پیا۔ صرف تھوڑے سے لوگ اس امتحان میں پورے اُتر سکے۔

بنی اسرائیل نے امیر لشکر کا انتخاب تو بڑے ہمہمہ سے کرایا لیکن یہ لوگ نظم اور ڈسپلن کے معاملے میں بالخصوص جہاں جان و مال کی قربانی کا سوال ہو بڑے کچے تھے۔ اس کا اظہار جیسا

کہ اوپر گزرا، سموئیل نبی نے پہلے ہی دن کر دیا تھا۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ انہی کی ہدایت سے طالوت نے اس امتحان کا اعلان کیا تاکہ ان کے کھرے کھوٹے میں پہلے ہی سے امتیاز ہو جائے اور عین میدان جنگ میں ان کے ہاتھوں دھوکا نہ کھانا پڑے، جو سچے ہیں وہ پہلے ہی سے چھٹ کے الگ ہو جائیں یہ امتحان چونکہ سموئیل نبی کی ہدایت کے تحت ہوا اس وجہ سے طالوت نے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا۔ جس ندی کے ذریعہ سے یہ امتحان ہوا اس کا نام یہاں مذکور نہیں اس لئے کہ مقصود امتحان کا ذکر ہے نہ کہ کسی ندی کا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ دریائے اردن ہو اور اس کا بھی امکان ہے کہ اس وادی کے درمیان کا کوئی چشمہ یا نالا ہو جو دونوں فوجوں کے درمیان حائل تھی۔

اس امتحان میں سو فیصدی کامیابی کے لئے تو شرط یہ تھی کہ اس کا پانی سرے سے کوئی چکھے ہی نہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے "وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ"۔ لیکن ایک آدھ چلو پی لینے کو قابل درگزر قرار دیا گیا تھا لیکن اس کے ساتھ بھی "بیدہ" کی قید لگی ہوئی تھی کہ مبادا یہ اجازت کٹورے، گلاس اور ڈونگے تک نوبت پہنچا دے۔ "وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ" سے وہ صداقت شعار اور کامل الایمان لوگ مراد ہیں جو اس امتحان میں پورے اترے۔ یہاں "اٰمَنُوْا" کا فعل اپنے کامل معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی وہ لوگ جو اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جو لوگ اس امتحان میں پھسڈی ثابت ہوئے وہ اپنے دعوائے ایمان میں بھی منافق تھے۔

"قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ" ظاہر ہے کہ یہ ان لوگوں کا قول ہے جو خوب پانی پی پی کے وہیں ڈھے گئے۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ندی کو پار کرنے کی بھی زحمت نہیں اٹھائی بلکہ اسی پار سے کھڑے کھڑے انہوں نے آگے بڑھنے والے ساتھیوں کو سنا دیا کہ اب ہم میں جالوت اور اس کی فوجوں سے لڑنے کی ہمت نہیں۔ یہاں جالوت کے نام لینے سے اس بات کا اظہار ہو رہا ہے کہ اس کی ہیبت ان لوگوں کے دلوں پر بہت تھی۔

"قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ الاٰية" لفظ ظن کی تحقیق ہم آیت ۴۶ کے تحت بیان کر آئے ہیں۔ یہ اوپر والے بزدلوں کے جواب میں طالوت اور ان کے باایمان ساتھیوں کا قول ہے۔ ان کی خاص صفت جس کا یہاں ذکر فرمایا وہ یہ ہے کہ وہ اللہ سے ملنے کا گمان رکھتے تھے۔ اس خاص صفت کے ذکر کی وجہ، جیسا کہ آیت ۱۵۴ کے تحت ہم بیان کر آئے ہیں، یہ ہے کہ وہ حقیقی شجاعت

فتح کا انحصار کثرت و قلت پر نہیں بلکہ عزم و ایمان پر ہے

جو خدا کی راہ میں موت کو زندگی سے بھی زیادہ عزیز و محبوب بنا دیتی ہے وہ مومن کے اس عقیدے سے پیدا ہوتی ہے کہ خدا کی راہ میں قتل ہونے والے مرتے نہیں ہیں بلکہ حقیقی زندگی اور اپنے رب کی ملاقات سے مشرف ہوتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے ہمت چھوڑ بیٹھنے والے ساتھیوں کو ابھارا کہ فلسطینیوں کی کثرت تعداد سے مرعوب ہو کر ہمت نہ ہارو، اصل شے تعداد نہیں بلکہ اللہ کی تائید اور اس کی نصرت ہے۔ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ نہایت قلیل التعداد گروہ محض اللہ کے حکم اور اس کی تائید سے دل بادل فوجوں پر غالب آگیا ہے۔ خدا کی تائید حاصل کرنے کیلئے جو چیز مطلوب ہے وہ صبر و استقامت اور عزم و ہمت ہے نہ کہ تعداد کی کثرت و قلت۔ شاید طالوت کے بیٹے یوناتن نے اسی موقع پر وہ فقرہ کہا ہو جو سموئیل میں نقل ہے۔

"سو یوناتن نے اس جوان سے جو اس کا سلاح بردار تھا کہا آ ہم اُدھر ان نامختونوں کی چوکی کو چلیں، ممکن ہے کہ خداوند ہمارا کام بنا دے کیونکہ خداوند کے لئے بہتوں یا تھوڑوں کے ذریعے سے بچانے کی قید نہیں"

سموئیل باب ۱۴ ۶

تورات میں اس امتحان کا ذکر نہیں ہے لیکن اسی سے ملتے جلتے ایک امتحان کا ذکر ہے۔

"اور اسرائیلی مرد اس دن بڑے پریشان تھے کیونکہ ساؤل نے لوگوں کو قسم دے کر یوں کہا تھا کہ جب تک شام نہ ہو اور میں اپنے دشمنوں سے بدلہ نہ لے لوں اس وقت تک اگر کوئی کچھ کھائے تو وہ ملعون ہو۔ اس سبب سے ان لوگوں میں سے کسی نے کھانا چکھا تک نہیں اور سب لوگ جنگل میں جا پہنچے اور وہاں زمین پر شہد تھا اور جب یہ لوگ جنگل میں پہنچ گئے تو دیکھا کہ شہد ٹپک رہا ہے پر کوئی اپنا ہاتھ اپنے منہ تک نہیں لے گیا اس لئے کہ ان کو قسم کا خوف تھا لیکن یوناتن نے اپنے باپ کو ان لوگوں کو قسم دیتے نہیں سنا تھا سو اس نے اپنے ہاتھ کے عصا کے سرے کو شہد کے چھتے میں بھونکا اور اپنا ہاتھ اپنے منہ سے لگا لیا اور اس کی آنکھوں میں روشنی آئی۔ تب ان لوگوں میں سے ایک نے اس سے کہا کہ تیرے باپ نے لوگوں کو قسم دے کر سخت تاکید کی تھی اور کہا تھا کہ جو شخص آج کے دن کھانا کھائے وہ ملعون ہو۔ اور لوگ بے دم سے ہو رہے تھے۔ تب یوناتن نے کہا

تورات اور قرآن کے بیان کا اختلاف

کہ میرے باپ نے ملک کو دکھ دیا ہے، دیکھو، میری آنکھوں میں ذرا سا شہد چکھنے سے کیسی روشنی آئی! کتنا زیادہ اچھا ہوتا اگر سب لوگ دشمن کی لوٹ میں سے جو ان کو ملی دل کھول کر کھاتے ..... سو وہ لوگ لوٹ پر گرے اور بھیڑوں، بکریوں، بیلوں اور بچھڑوں کو لے کر ان کو زمین پر ذبح کیا اور خون سمیت کھانے لگے۔"

سموئیل باب ۱۴ ۲۴-۳۲

اس واقعے سے یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ طالوت نے فلسطینیوں سے جنگ کے موقع پر اپنی فوج کا امتحان لیا تھا اور اس امتحان میں ان کی پوری فوج ناکام رہی تھی یہاں تک کہ طالوت کے بیٹے یونتن بھی، جن کا کردار تورات کے دوسرے بیانات سے نہایت بلند ثابت ہوتا ہے اس امتحان میں نہ صرف یہ کہ ناکام رہے بلکہ مذکورہ بالا بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ انہی کی غلط رہنمائی سے ان کے باپ کی پوری فوج گمراہ ہوئی۔

قرآن کا بیان مندرجہ ذیل پہلوؤں سے تورات کے بیان سے مختلف ہے۔

ایک یہ کہ تورات سے ثابت ہوتا ہے کہ طالوت نے یہ امتحان اس وقت لیا ہے جب دشمن سے عملاً مڈبھیڑ ہو چکی ہے۔ اور مقصود اس امتحان سے صرف یہ تھا کہ جب تک دشمن کا اچھی طرح قلع قمع نہ ہو جائے لوگ کھانے پینے میں مصروف نہ ہوں۔ برعکس اس کے قرآن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ طالوت نے یہ امتحان دشمن سے مڈبھیڑ ہونے سے پہلے لیا ہے اور مقصود اس سے اپنی فوج کا جائزہ لینا تھا کہ اس میں کتنے ایسے ہیں جو کٹھن حالات میں ثابت قدم رہ سکیں گے اور کتنے محض دکھاوے کے مجنوں ہیں جن کا دعوائے عشق آزمائش کی پہلی ہی چوٹ سے ہرن ہو جائے گا۔

دوسرا یہ کہ تورات سے ثابت ہوتا ہے کہ طالوت نے کھانے کی مناہی کی تھی۔ اس کے برعکس قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مناہی فوج کے مارچ کے دوران میں ایک خاص ندی یا نالے کے پانی کے لئے تھی۔

تیسرا یہ کہ تورات سے ثابت ہوتا ہے کہ طالوت کی پوری فوج اس امتحان میں ناکام رہی یہاں تک کہ خود ان کے فرزند بھی ناکام رہے بلکہ انہی نے پوری فوج کے لئے اس ناکامی کی راہ کھولی۔ اس کے خلاف قرآن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کے اندر سے ایک جماعت اپنے عزم و ایمان پر قائم رہی اور اسی کے عزم و ایمان کی بدولت اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو فلسطینیوں پر فتح دی۔

قرآن کا بیان صحیح اور بامقصد

اب یا تو یہ مانا جائے کہ تورات میں جو واقعہ بیان ہوا ہے وہ الگ ہے اور قرآن میں جو بیان ہوا ہے وہ الگ ۔ یا یہ مانا جائے کہ واقعہ تو ایک ہی ہے، تورات میں اس کو بے احتیاط راویوں نے بالکل مسخ اور بے مقصد بنا کے رکھ دیا ہے قرآن نے اس کو بالحق یعنی بالکل ٹھیک ٹھیک اور اس کے فوائد و مصالح کے ساتھ سنا دیا۔ ان دونوں میں سے جو بات بھی صحیح ہو، یہ بہر حال ہر صاحب ذوق تسلیم کرے گا کہ قرآن کا بیان ہر پہلو سے بامقصد، نتیجہ خیز اور پُر حکمت ہے۔ برعکس اس کے تورات کا بیان ایک بالکل بے مقصد داستان سرائی ہے۔

بقیہ مضمون تذکرہ و تبصرہ صفحہ ۸ سے آگے

صحیح صحیح اندازہ تو نہیں کر پایا ہوں لیکن اُمید یہی ہے کہ یہ کارآمد اور مستقل مزاج ثابت ہوں گے۔

اب شدید ضرورت اس بات کی محسوس ہو رہی ہے کہ ایک جید عالم کی خدمات پورے وقت کے لئے اس ادارہ کے واسطے حاصل کی جائیں۔ ادارے کے پڑوس میں ایک اسلامی ہاسٹل کی شکل آپ سے آپ پیدا ہو رہی ہے، اب لازماً کام کے دائرے کو وسیع کرنا پڑے گا۔ اور اس کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہی ہے کہ ایک شخص اپنا پورا وقت ان طلبہ کی تعلیم و تربیت پر صرف کرے۔

ہمارے مخلصین میں سے ڈاکٹر غلام رسول حیمہ صاحب لائلپور نے ادارے کی اعانت میں شرکت کر کے ہماری حوصلہ افزائی کی ہے جس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

افاداتِ فراہیؒ
خالد مسعود صاحب

عصمتِ انبیاء

عصمتِ انبیاء کا مسئلہ ایک نزاعی مسئلہ ہے۔ یہود و نصاریٰ نے تو انبیاء علیہم السلام پر ایسے ایسے بہتان لگائے ہیں جن کو سن کر ہر سلیم الفطرت آدمی کا دل کانپ جاتا ہے البتہ مسلمانوں کے درمیان عصمتِ انبیاء کے مسئلہ میں کوئی حقیقی اختلاف نہیں۔ تاہم چونکہ مختلف لوگوں نے اس سلسلہ میں الگ الگ تعبیریں پیش کی ہیں اس لئے بظاہر یہ مسئلہ مسلمانوں کے ہاں بھی نزاعی اور الجھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ذیل کے صفحات میں ہم اس کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے اور اگر خدا کی توفیق شاملِ حال رہے تو اس وضاحت کی روشنی میں ہمارے باہمی اختلافات دور ہو سکتے ہیں۔

علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ گناہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو صلحاء و ابرار کی نسبت سے گناہ قرار پاتے ہیں، دوسرے عام لوگوں کے گناہ۔ انبیاء کی طرف جب کبھی گناہ یا خطا کی نسبت کی جاتی ہے تو اس سے مراد پہلی ہی قسم کے گناہ ہوتے ہیں۔

علماء کی اس بات کو اگر مزید کھولا جائے تو یہ بہت قوی معلوم ہوتی ہے، کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ بندے کا مؤاخذہ اس چیز میں ہوتا ہے جو اس پر واجب کی گئی ہو۔ حیوانات کو دیکھئے، ہمارے احکام ان پر نافذ نہیں ہوتے اسی طرح مختلف امتوں کا مؤاخذہ انہی امور میں ہوا جو ان پر فرض کئے گئے تھے۔ مؤاخذہ کے اس قانون کا اطلاق جس طرح ہماری عام زندگی میں ہے اسی طرح اس کے تحت انبیاء سے بھی باز پرس ہوتی ہے۔

اُوپر ہم بیان کر چکے ہیں اور عقل و نقل کے تمام پہلوؤں سے بھی یہ بحث طے پا چکی ہے کہ اللہ

تعالیٰ نے ہمیشہ فرض رسالت کی ادائیگی کے لئے انہی لوگوں کو چنا ہے جو اس کی مخلوق میں اخلاق و تقویٰ کے لحاظ سے نقطہ کمال پر رہے ہیں۔ چنانچہ فرمایا

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ اور اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت کا بوجھ کن پر ڈالے۔

حضرت سرورِ کائنات کی نسبت فرمایا

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (قلم-۴) بیشک تم ایک خلقِ عظیم پر ہو۔

اس مضمون کی توضیح صحیحین کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا گیا اور بقیہ تمام مخلوق کو دوسرے پلڑے میں، جب آپ تمام مخلوق پر بھاری ثابت ہوئے تب آپ کا انتخاب فرض رسالت کی ذمہ داریوں کے لئے عمل میں آیا

اس برگزیدگی کے بعد اللہ تعالیٰ انبیاء کی تربیت فرماتا ہے، ان کو اپنے امر و نہی سے مطلع فرماتا ہے اور جن چیزوں سے وہ ناواقف ہوتے ہیں ان کو ان کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ ہر لمحہ اس کے اشاروں پر چلتے اور اس کی نگاہوں میں رہتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا (بیشک تو ہماری نگاہوں میں ہے) دوسرے مقام پر فرمایا ہے۔

فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ۝ (جن ۲۷، ۲۸) پس وہ ان کے آگے اور پیچھے پہرہ رکھتا ہے تاکہ وہ دیکھ لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغام پہنچا دیئے اور ان کے سارے معاملات اس کے احاطہ میں ہیں اور اس نے ہر چیز کو شمار کر رکھا ہے۔

یعنی عالم غیب کی ایک مخصوص نگاہ انبیاء کرام کی نگرانی کرتی رہتی ہے اور ان کو لغزشوں سے بچاتی ہے قبل اس کے کہ وہ کسی غلط راہ پر قدم رکھیں خدا کا ہاتھ ان کی رہنمائی کے لئے نمودار ہو جاتا ہے۔ اگر کبھی وہ کسی پرخطر راہ میں نکل جاتے ہیں تو صرف اتنی دیر تک کے لئے ان کو وہاں چھوڑا جاتا ہے جتنی دیر میں وہ اپنے فرض نبوت اور منصب دعوت و تبلیغ کی ذمہ داریوں کو ادا کر لیں، اس سے زیادہ ان کو وہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔

پس جب کبھی اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے کہ اس کے رسول کے قدم کسی ایسی جگہ پہنچ گئے ہیں جہاں لغزش کا اندیشہ ہے تو وہ فوراً اس کو تنبیہ کر دیتا ہے۔ اور اگر وہ جوش وانہماک میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے تو بعض اوقات نہایت کھلے لفظوں میں بلکہ باندازِ عتاب اس کو روکا جاتا ہے۔ تاکہ جس چیز سے منع کیا جا رہا ہے اس کی اصلی اہمیت اس کے سامنے واضح ہو جائے۔ پیغمبر اس وقت چونک جاتا ہے اور سامنے کے خطرہ کو دیکھ کر محسوس کرتا ہے کہ اگر خدا کے غیر مرئی ہاتھ نے رہنمائی نہ کر دی ہوتی تو وہ تو بالکل خطرہ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ یہ چیز اس کے شکر وانابت کے جذبہ میں ایک جوش پیدا کرتی ہے اور وہ خضوع وخشوع کی تمام نیازمندیوں کے ساتھ اپنے پروردگار کے سامنے گر پڑتا ہے اور اس سے اور زیادہ قریب ہو جاتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے بچہ ماں کے ڈرا دینے کے بعد اس کے سینے سے اور زیادہ چمٹ جاتا ہے۔

الغرض پیغمبر کا رجحان ہر حالت میں بھلائی اور نیکی ہی کی طرف ہوتا ہے۔ اس کا دل ہوا و ہوس کی آلودگیوں سے بالکل پاک ہوتا ہے۔ اس کا ہر قدم مرضیات الٰہی کی راہ میں اٹھتا ہے لیکن اسی راہ میں کبھی کبھی وہ افراط کی حالت اختیار کر لیتا ہے۔ جادہ حق پر ثابت قدمی، اولوالعزمی اور بیدار مغزی میں یہ افراط وتفریط اور اپنے مشن کی تکمیل کی راہ میں خدشات، اندیشوں اور غم کا لاحق ہونا وہ امور ہیں جو انبیاء ورسل کے لئے "گناہ" قرار پاتے ہیں۔ لیکن جب کبھی نبی اس حالت سے دوچار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو حق واعتدال کی بیچ راہ پر لاکر کھڑا کر دیتا ہے کیونکہ پیغمبر اپنی قوم کے لئے نمونہ اور اُمت کا قبلہ ومرکز ہوتا ہے۔ اس کی ہر چھوٹی بڑی بات پیروی واقتداء کے لئے ہوتی ہے پس اس کے کسی فعل میں اگر افراط کا ادنیٰ شائبہ بھی پایا گیا تو اس سے تمام اُمت کی راہ کج ہو سکتی ہے۔

پیغمبروں کے مواقع عتاب

چونکہ باطن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور نبی انسانوں کے باطن سے بے خبر ہوتا ہے، اس لئے پیغمبر کبھی کسی شخص کی اصلاح سے مایوس نہیں ہوتا۔ کوئی شخص انکار وسرکشی کی کتنی ہی شدید حالت اختیار کر لے لیکن وہ ایک غمگسار دوست اور ایک ہمدرد طبیب کی طرح اس کے پیچھے لگا رہتا ہے۔ اور جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ظاہر نہ کر دیا جائے کہ فلاں شخص اللہ کا دشمن ہے، ایمان

نہ لائے گا، نبی اس کے ایمان و ہدایت سے مایوس نہیں ہوتا۔ البتہ جب اللہ تعالیٰ خود اعلان کر دیتا ہے کہ فلاں شخص اللہ کا دشمن ہے، اب اس پر ایمان و ہدایت کی راہ باز نہ ہوگی، اس سے علیحدگی اختیار کر لو تو نبی اس سے برأت کا اعلان کر دیتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کے لئے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لئے رافت و محبت کی وجہ سے بخشش کی دعا کی تو ان کو اس پر ٹوکا گیا لیکن جب حقیقت حال ان پر واضح کر دی گئی تو انہوں نے ان سے برأت کا اظہار کر دیا۔ اس معاملہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسوۂ قرآن مجید نے متعدد مقامات میں بیان کیا ہے۔

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِّلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ۚ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ ۝ (توبہ ۱۱۴)

پس جب اس پر یہ بات کھل گئی کہ وہ (آزر) اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے علیحدہ ہو گیا۔ بیشک ابراہیم بہت ہی دردمند اور بردبار تھا۔

اسی طرح جب حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ نے فرعون کی تباہی کی دعا کی تو ان کو تنبیہ کی گئی کہ اس کے بعد آل فرعون کے لئے رافت و رحمت کا اظہار نہ کریں اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلے جب کبھی قوم فرعون پر عذاب آیا تو حضرت موسیٰ فرعون کی درخواست پر خدا سے یہ دعا کرتے کہ وہ اسے عذاب سے نجات دے دے۔ مگر ہر بار فرعون پھر وعدہ خلافی کرتا اور ایمان نہ لاتا۔ فرمایا

قَالَ قَدْ أُجِيبَت دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيمَا وَلَا تَتَّبِعَانِّ سَبِيلَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (یونس ۸۹)

کہا تمہاری دعا قبول کر لی گئی، پس تم اس پر ثابت قدم رہنا اور ان لوگوں کے راستے پر نہ چلنا جو نہیں جانتے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رافت و رحمت کے اس تعلق کی بنا پر جو آپ کو اپنی ازواج کے ساتھ تھا شہد کا کھانا موقوف کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے معاملے کی حقیقت سے آپ کو آگاہ کیا کہ اس کے نتیجے میں لوگ ایک حلال چیز سے دستکش ہو جائیں گے اور رہبانیت کی طرف مائل ہونگے۔

کبھی کبھی اس کے برعکس حالت بھی پیش آتی ہے یعنی پیغمبر کسی جماعت کی سرکشی اور تمرد کو دیکھ کر اس کے ایمان و ہدایت کی طرف سے بالکل مایوس ہو جاتا ہے حالانکہ وہ جماعت ابھی اس حد کو نہیں پہنچی ہوتی ہے کہ اس سے مایوس ہو جایا جائے۔ اس کے جینے اور پنپنے کی ایک ہلکی سی

آس باقی ہوتی ہے۔ ان حالات میں پیغمبر کی مایوسی پر اسے باندازِ عتاب حکم ہوتا ہے کہ ان کے اندر تبلیغ و دعوت کا جہاد جاری رکھے اور جب تک حکم خداوندی نہ ہو، وہ حق کو کتنی ہی بیدردی کے ساتھ ٹھکرائیں، وہ ان کو نہ چھوڑے۔ قرآن مجید میں اس کی مثال حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ ہے۔

غرض کبھی نبی کے کمال رحمت و شفقت پر عتاب ہوتا ہے اور کبھی کمال غیرت حق پر۔ اور یہ دونوں حالتیں ایسی ہیں جو نفس کی آلائشوں سے پاک ہیں۔

نبی معصیت کا مرتکب نہیں ہوسکتا

ہم بیان کر چکے ہیں کہ نبی کی زندگی تمامتر خدا کی نگرانی میں بسر ہوتی ہے اور جب کبھی اس کے پائے ثبات میں لغزش آنے لگتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو تھام لیتا ہے۔ اسی لئے نبی معصیت کا مرتکب کبھی نہیں ہوتا۔ قرآن میں نبی کی خطا کے لئے معصیت کا لفظ صرف ایک موقع پر استعمال ہوا ہے اور وہ حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ میں ہے۔ لیکن وہاں بھی جو حقیقت حال قرآن نے بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ آدمؑ نے شجر ممنوعہ کو عمداً کھا کر خدا کی نافرمانی نہیں کی بلکہ وہ اپنے عزم کی کمزوری کے باعث خدا کے ساتھ اپنے عہد کو بھول گئے تھے۔ چنانچہ جب شیطان نے ان کا خیر خواہ ہونے کی قسم کھائی تو وہ اس کے بہکانے میں آگئے اور بھولے سے ممنوعہ پھل کھالیا۔ قرآن میں آتا ہے۔

وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ۝ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ۝ (طٰہٰ ۱۲۱، ۱۲۲)

اور آدم نے اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کی اور بہک گیا۔ پھر پروردگار نے اسی کو منتخب کر لیا تو اس کی توبہ قبول کر لی اور ہدایت بخشی۔

دوسرے موقع پر فرمایا

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ۝ (طٰہٰ ۱۱۵)

اور ہم نے پہلے آدم سے عہد لیا تھا مگر وہ اسے بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہیں پایا۔

مزید برآں قرآن سے یہ بھی ثابت ہے کہ آدمؑ سے یہ خطا اس وقت سرزد ہوئی تھی جب تک انہیں نبوت سے سرفراز نہیں کیا گیا تھا۔ فرمایا

ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى

پھر اس کے رب نے اسے منتخب کر لیا تو اس کی

(طٰہٰ ۱۲۲) توبہ قبول کی اور ہدایت بخشی۔

اور قرآن کے نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتبٰی کا لفظ نبوت ہی کی تعبیر کے لئے آتا ہے۔

یوں بھی دیکھا جائے تو آدمؑ کے قیام جنت کے زمانہ میں ان کی نبوت کا کوئی موقع نہ تھا۔

اگر کسی کو یہ اعتراض ہو کہ بھول چوک (نسیان) پر کوئی مواخذہ نہیں ہوا کرتا، پھر آدمؑ پر اس معاملہ میں کیوں گرفت ہوئی تو اس کا جواب یہ ہے کہ ابرار کے لئے وہ نسیان بھی گناہ کے دائرہ میں آتا ہے جو کسی ایسے معاملہ میں ہو جس میں رب نے ان کو تلقین کر دی ہو۔

نبی کے سوا کوئی معصوم نہیں ہوتا

نبی کے سوا کوئی انسان معصوم نہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ غیر نبی لازماً گناہ کرتا ہے بلکہ ہماری مراد صرف یہ ہے کہ غیر نبی کی معصومیت کا ہمیں اعتماد اور یقین حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اسے بھی معصوم سمجھ کر ہم ہر معاملہ میں اس کی پیروی شروع کر دیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے اس کو وہ درجہ دے دیا جو فی الحقیقت ایک نبی کا درجہ ہے۔

قرآن نے ہمیں بتایا ہے کہ نبی دنیا سے اسی وقت رخصت ہوتا ہے جب وہ لوگوں کے لئے صراط مستقیم کو واضح کر چکتا ہے۔ اگر لوگ اپنی خواہشات کے پیچھے چل کر یا سرکش حکمرانوں کی پیروی میں حق کی راہ کو اختیار نہ کریں تو اس کا گناہ انہی پر ہوگا۔ خدا نے جب ایک مرتبہ حجت تمام کر دی اور مشعل ہدایت روشن کر دی تو اب اس کی ذمہ داری یہ نہیں کہ وہ ہر زمانے میں ایسے معصوم اشخاص بھیجتا رہے جو رسولوں کی طرح خدا کی خصوصی عنایت سے تربیت پائے ہوئے ہوں۔ حقیقت میں نبی کے بعد یہ اُمت کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ یہ احساس رکھے کہ اس کا مواخذہ اسی تعلیم کے مطابق ہوگا جو خدا نے نبی پر اُتاری۔ ذمہ داری کے اسی احساس کی بنا پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خلافت کے بعد اپنے پہلے ہی خطبہ میں یہ واضح کیا کہ میں اسی راستہ کی پیروی کروں گا جس کی تکمیل اللہ تعالےٰ نے کر دی ہے۔ اور اب کسی ایسے کام کی گنجائش نہیں جو بدعت ہو یا حکم شریعت کے خلاف ہو۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے اُمت کی اس ذمہ داری کا اقرار کرتے ہوئے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ اُمت میں ایسے لوگ موجود ہیں جو عدل و انصاف کے علمبردار ہیں اور ہر کجی کو سیدھا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ نبی کے بعد کسی قائد یا امیر کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ لوگوں سے اپنی غیر مشروط پیروی کرائے۔ اس کا اختیار بس اسی قدر ہے کہ وہ لوگوں کو معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے۔ قرآن نے اس مسئلہ کی یوں وضاحت فرمائی ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ۖ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا۔ (نساء ۵۹)

اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی بھی جو تم میں سے صاحب حکومت ہیں۔ اور اگر کسی بات میں تمہارے درمیان اختلاف ہو جائے تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ بات تمہارے لئے بہتر اور انجام کے لحاظ سے اچھی ہے۔

اس آیت سے قرآن نے ہمیں دو حقیقتوں کی تعلیم دی ہے۔ ایک یہ کہ خدا اور رسول کے حکم کی اطاعت واجب ہے؛ اس میں کسی نزاع کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔ البتہ اگر اولوالامر کی جانب سے کوئی ایسی بات سامنے آئے جس میں نزاع پیدا ہوتا ہو تو اس صورت حال کا علاج لازماً ہونا چاہیئے۔ دوسری یہ کہ اس شکل میں بھی قضیہ خدا اور رسول ہی کی طرف فیصلے کے لئے لوٹانا چاہیئے۔ گویا اس آیت میں یہ محکم اصول بیان کر دیا کہ اللہ اور رسول کے علاوہ کسی کی مطلق اطاعت باطل ہے۔

اس آیت میں "اطیعوا" کے تکرار سے یہ تعلیم دینی مقصود ہے کہ رسول کی اطاعت ہمارے اوپر مستقلاً واجب ہے کیونکہ وہ ہر وقت اللہ کی نگرانی اور حفاظت میں ہوتا ہے۔ رسول کے سوا یہ حق کسی کو حاصل نہیں۔ اس سے واضح ہوا کہ نہ تو کسی غیر نبی کو معصومیت کا دعویٰ کرنے کا اختیار حاصل ہے اور نہ ہمیں اس کی اجازت ہے کہ ہم اس کا یہ مقام تسلیم کریں۔

مقالات

امین احسن اصلاحی

مولانا محمد علیؒ مدرسۃ الاصلاح میں

فاضل محترم مولانا رئیس احمد جعفری نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق میں چند تاثرات قلم بند کردوں۔ میں اس فرمائش کی تعمیل کے لئے آمادہ تو ہوگیا ہوں لیکن یہ بات مضمون کے پہلے مرحلہ ہی میں واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے مولانا سے صرف نسبت غائبانہ عقیدت ہی کی حاصل ہے، ان سے ملنے جلنے کے مواقع تو درکنار ان کو دور دور سے دیکھ لینے کی سعادت بھی شاید دو تین بار سے زیادہ مجھے حاصل نہیں ہوئی ہے تحریک خلافت کے شباب کے زمانے میں، سن ٹھیک طرح یاد نہیں (غالباً ۱۹۲۱ء یا ۱۹۲۲ء میں) مولانا مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر ضلع اعظم گڑھ، یو۔پی بھارت) کے سالانہ جلسہ میں تشریف لائے۔ میں اس وقت مدرسۃ الاصلاح میں آخری درجوں کا طالبعلم تھا۔ اس جلسہ میں مجھے یاد ہے کہ مولانا کا نام سن کر مدرسہ کے وسیع میدان میں بے پناہ خلقت جمع ہوئی۔ مولانا کے ساتھ وقت کے بعض دوسرے اکابر و مشاہیر بھی تشریف لائے، میرے استاذ مولانا حمید الدین فراہی کسی جلسہ میں کبھی مشکل ہی سے شریک ہوتے تھے، لیکن اس جلسہ میں وہ بھی شریک ہوئے۔ بڑا عظیم اجتماع تھا، میں نے اس سے پہلے اس سے بڑا اجتماع کوئی نہیں دیکھا تھا، جلسہ کھلے میدان میں تھا۔ ہوا نہایت تند چل رہی تھی۔ اس زمانہ تک لاؤڈ سپیکر کا رواج نہیں ہوا تھا۔ اس وجہ سے اندیشہ تھا کہ مولانا کی تقریر سُنی نہ جا سکے گی جس سے جلسہ میں انتشار پیدا ہو جائے گا لیکن جب مولانا تقریر کے لئے کھڑے ہوئے تو اُن کے رُعب و دبدبہ نے ہر شخص کو اس طرح مرعوب و مسحور کر لیا کہ جو شخص جس جگہ کھڑا یا بیٹھا تھا وہیں پیکرِ تصویر بن کر رہ گیا ——

مولانا کی بلند اور پرشکوہ آواز ہوا کی تندی اور مجمع کی غیر معمولی وسعت کے باوجود ہر گوشہ میں پہنچنے لگی اور تقریر کے اثر کا عالم یہ ہوا کہ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک آنکھ بھی ایسی نہ تھی جو رو نہ رہی ہو۔ یہ مجمع بالکل دیہاتیوں کا تھا، اس میں پڑھے لکھے لوگ بہت تھوڑے سے تھے، ان دیہاتیوں کے لئے مولانا محمد علیؒ جیسے شخص کی کسی تقریر کو سمجھنا کچھ آسان کام نہیں تھا لیکن ان کی تقریر میں ایمان ویقین کی ایسی گرمی اور سوز و درد کی ایسی گھلاوٹ تھی کہ اس سے متاثر ہونے کیلئے شائد اس کو زیادہ سمجھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

اس موقع کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے جو قابلِ ذکر ہے۔ مولاناؒ کی تقریر جب ختم ہوگئی تو ہم نے دیکھا کہ مجمع کے ایک کنارے سے ایک بوڑھا دیہاتی اُٹھا اور وہ مجمع کو چیرتا پھاڑتا سیدھا اسٹیج کی طرف چلا۔ اگرچہ اسٹیج تک پہنچنے میں اس کو سخت مزاحمتوں سے سابقہ پیش آیا لیکن وہ اپنی دھن کا ایسا پکا نکلا کہ اس نے مولاناؒ کے پاس پہنچ کر ہی دم لیا۔ اور پہنچتے ہی اُن کی ڈاڑھی پر ہاتھ رکھ کر اپنے مخصوص لہجہ میں بولا کہ:

"محمد علی! جو تو نے کیا وہ کسی سے نہ ہو سکا" یہ کہہ کر جب وہ واپس مڑا تو مولاناؒ نے فرمایا۔ کہ:

"اس طرح کی داد بھی آپ کے سوا مجھے کسی اور سے نہیں ملی"

اس موقع پر مولاناؒ کی عظمت کا ایک اور پہلو میرے سامنے اپنے استاذ مولانا فراہیؒ کے تاثرات سے واضح ہوا۔ اس جلسہ میں تقریر کر کے، مولانا محمد علیؒ اعظم گڑھ شہر کے لئے روانہ ہوگئے جہاں شب میں اُن کو ایک جلسۂ عام میں تقریر کرنی تھی، وہ گئے تو ان کے ساتھ مدرسۃ الاصلاح کا سارا جلسہ بھی چلا گیا، یہاں تک کہ خود مولانا فراہی بھی جو مدرسہ کے ناظم تھے ان کی تقریر میں شرکت کے لئے اُن کے ساتھ چلے گئے۔ انہوں نے چلتے وقت ہمیں یہ ہدایت کی کہ کچھ کٹے ہوئے کاغذ اور چند اچھی پنسلیں اُن کے سامان میں رکھ دی جائیں تاکہ وہ اعظم گڑھ میں ہونے والی مولانا محمد علیؒ کی تقریر نوٹ کر سکیں۔ یہ معاملہ میرے لئے نہایت حیرت انگیز تھا، میں اس بات سے تو واقف تھا کہ مولانا فراہیؒ مولانا محمد علیؒ اور مولانا آزاد سے محبت کرتے ہیں لیکن ان میں سے کسی کی تقریر سے مولانا کا اس درجہ متاثر ہونا کہ وہ خود اس کے نوٹ کرنے کا اہتمام کریں میرے تصور سے مافوق تھا۔ مولانا نہ تو جذباتی آدمی تھے، نہ کوئی سیاسی آدمی۔ وہ ایک محقق ایک فلسفی اور ایک حکیم تھے،

وہ جیسا کہ میں نے اُوپر عرض کیا وعظ و تقریر کے جلسوں میں، خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیاسی، کبھی مشکل ہی سے شریک ہوتے تھے لیکن مولانا محمد علیؒ کی تقریر میں شریک ہونے کے لئے نہ صرف یہ کہ سفر کے لئے آمادہ ہو گئے بلکہ ان کی تقریر کے نوٹ لینے کے لئے یہ اہتمام فرمایا۔ مولانا کے اس اہتمام نے میرے دل میں مولانا محمد علیؒ کی عظمت بہت بڑھا دی۔ میں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی ایک عظیم سیاسی لیڈر ہی نہیں بلکہ وہ علمی و عقلی اعتبار سے بھی ایسے بلند پایہ آدمی ہیں کہ مولانا فراہی جیسے لوگ بھی ان کی تقریروں کو یہ درجہ دیتے ہیں کہ ان کے نوٹ لیتے ہیں۔

اس واقعہ کے دوسرے ہی دن مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ مولانا محمد علیؒ کی تقریر میں وہ کیا چیز تھی جس سے استاذ مرحوم اس درجہ متاثر ہوئے ـــــ دوسری صبح کو جب مولانا فراہیؒ مدرسہ پر واپس آئے تو منتظمین میں سے بعض نے ان سے دبی زبان سے یہ شکایت کی کہ مولانا محمد علی کے ساتھ اُن کے چلے جانے کے سبب سے خود مدرسہ کا جلسہ درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ مولانا نے اس کا جواب یہ دیا کہ:

"جو کام کی باتیں تھیں، وہ محمد علی نے اپنی تقریر میں کہہ دی تھیں، اس کے بعد کسی اور تقریر کی اب کیا ضرورت باقی رہی تھی"۔

مولانا نے یہ بات اس اعتماد اور یقین کے ساتھ فرمائی کہ ہر شخص پر یہ بات واضح ہو گئی کہ مولانا کو مدرسہ کے جلسہ کے درہم برہم ہو جانے کا ذرہ برابر بھی افسوس نہیں ہے، ان کے نزدیک سننے کی باتیں وہی تھیں جو مولانا محمد علی نے کہہ دی تھیں اور لوگوں نے وہ سُن لی تھیں، اس کے بعد جلسہ کا جاری رہنا ان کے نزدیک گویا اضاعتِ وقت کے حکم میں تھا۔ مولانا نے اس کے بعد متعدد بار مولانا محمد علی کی تقریر پر اپنی پسندیدگی کا اظہار فرماتے ہوئے یہ بھی کہا کہ:

"محمد علی کی تقریر میں ایمان ہوتا ہے"۔

ایک مرتبہ بطور لطیفہ کے یہ بھی فرمایا۔ کہ:

"چونکہ محمد علی بہت ذہین آدمی ہیں اس وجہ سے لوگوں کو قرآن کے نظم کی طرح ان کی تقریروں اور تحریروں کے نظم کو سمجھنے میں بھی بسا اوقات زحمت پیش آتی ہے"۔

پھر فرمایا کہ:

"کچھ اسی قسم کا حال مولانا محمد قاسمؒ کی تقریروں اور تحریروں کا بھی ہے۔"

اگرچہ بڑوں کے اس ذکر کے درمیان اپنا بیان کچھ مناسب نہیں لیکن جن کا کل سرمایۂ زندگی صرف وہ چند چھوٹی بڑی نسبتیں ہی ہوں جو بڑوں سے اُن کو حاصل ہوئیں وہ اگر ان کو بیان نہ کریں تو آخر اپنے طرۂ افتخار کی آرائش کے لئے سامان کہاں سے لائیں گے۔ اس وجہ سے مجھے یہ واقعہ ذکر کرنے کی اجازت دیجئے کہ یہی جلسہ، جس کا اوپر ذکر ہوا، اوّل اوّل مجھے پبلک میں روشناس کرانے کا ذریعہ بنا۔ وہ اس طرح کہ مجھے مدرسہ کی تعلیم و تربیت کا نمونہ دکھانے کے لئے مدرسہ کے ذمہ داروں کی طرف سے اس جلسہ میں ایک تقریر کرنے کی ہدایت کی گئی۔ چنانچہ میں نے اس میں ایک تقریر کی۔ یہ تقریر میری اپنی ہی تیار کردہ تھی اور اگرچہ کسی پبلک جلسہ میں یہ میری بالکل پہلی تقریر تھی لیکن میری عمر اور علم کے اعتبار سے نہایت کامیاب رہی ۔۔۔ مولانا محمد علیؒ اور اسٹیج پر بیٹھے ہوئے دوسرے اکابر نے اس کی بڑی تحسین فرمائی۔ یہاں تک کہ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے بصلۂ حسن تقریر اپنے تفسیری رسائل کا ایک سیٹ اپنے دستخط سے مزین فرما کر مجھے بطور انعام عنایت فرمایا۔ اس کے بعد مجھے دور دور سے جلسوں کی شرکت کے لئے دعوت نامے ملنے لگے اور میں کبھی کبھی جلسوں میں شریک بھی ہونے لگا۔ لیکن میں نے یہ لے زیادہ بڑھنے نہیں دی، اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے استاذ مولانا فراہیؒ زیادہ تقریریں کرنے کو سخت ناپسند فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ تو اُنہوں نے مجھ سے یہاں تک فرمایا کہ زیادہ تقریریں کرنے سے آدمی کا دل سیاہ ہو جایا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس چیز کو وہ اس درجہ ناپسند فرماتے ہوں اس کی طرف زیادہ راغب ہونا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔

تقریظ و تنقید

قرآنی حقائق تصوف کے آئینہ میں

تالیف : صاحبزادہ محمد عمر سجادہ نشین بیربل
صفحات : ۲۱۰ قیمت درج نہیں
ناشر : ادارہ تصوف - نظام بلڈنگ موہنی روڈ لاہور

اس کتاب کے مصنف تصوف کی اس قسم کے علمبردار ہیں جس کو علمائے دین نے ہمیشہ ضلالت سمجھا ہے - ان کے نزدیک علم شریعت ایک جسد اور طریقت اس کی روح ہے، اس لئے حقیقت شناسی کے جس مقام پر ایک ولی فائز ہوتا ہے، ایک صاحب شریعت نبی کی اس تک رسائی نہیں ہو سکتی - مزید برآں نبی کی تعلیم فرشتے کے واسطہ سے ہوتی ہے جب کہ ایک ولی تجلیات ربانی سے براہ راست فیضیاب ہوتا ہے - فاضل مصنف جہاد اور طلب رزق کے کاموں کو بھی کچھ غیر ضروری قرار دیتے ہیں اور بدر و اُحد کے سپہ سالار اور حنین و تبوک کے فاتح نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حقیقی مشن کو بھی انہوں نے ترک دنیا ہی سمجھا ہے - حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر نبی کے لئے انہوں نے جگہ جگہ جس بے ادبی کا مظاہرہ کیا ہے وہ بڑا ہی افسوسناک ہے

ہمارے نزدیک فاضل مصنف کے یہ تمام خیالات قرآن و سنت کی تعلیمات کے خلاف اور خود تصوف کے لئے رسوا کن ہیں - ہمیں تو ان لوگوں کی سلیم الفطرتی پر شبہ ہوتا ہے جو اپنے اوہام و تصورات اور ظن و تخمین کو اس علم و ہدایت پر ترجیح دیتے ہیں جس کو خدا نے "العلم" (علم حقیقی) اور "الہدیٰ" (ہدایت حقیقی) کے ناموں سے موسوم فرمایا ہے - جہاں تک سورۂ کہف کے مضامین سے ان کے استدلال کا تعلق ہے اس کے بارے میں ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ کاش وہ "قرآنی حقائق کو تصوف کے آئینہ میں" دیکھنے کے بجائے تصوف کے حقائق کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش

فرماتے۔

کتاب مجلد ہے اور سفید کاغذ پر چھپی ہے۔ اس میں جس طرح معنوی اغلاط کی کمی نہیں اسی طرح عبارت کی غلطیاں بھی اس میں کافی نظر آتی ہیں۔

(خ۔م)

چند اہم مطبوعات

تصانیف مولانا امین احسن اصلاحی

تدبر قرآن (قرآن فہمی کی رہنما)	۳/۲۵	عائلی کمیشن رپورٹ پر تبصرہ	۲/۲۵
اسلامی قانون کی تدوین	۲/۰۰ و ۳/۰۰	تزکیہ نفس	۳/۷۵
تدبر قرآن (تفسیر آیہ بسم اللہ و سورۂ فاتحہ)			۰/۷۵

مطبوعات دیگر مصنفین

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)	۲۲/۲۵	(آنحضرتؐ) سیرت ابن ہشام	۱۰/۰۰
ابوبکرؓ صدیق اکبر	۱۰/۰۰	آثار امام شافعیؒ	۱۲/۰۰
عمرؓ فاروق اعظم	۲۰/۰۰	حیات امام مالکؒ	۱۰/۰۰
امام اعظمؒ	۴/۰۰	حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ	۲۱/۰۰
حیات امام احمد بن حنبلؒ	۱۰/۰۰	تعبیر کی غلطی (جماعت اسلامی کا جائزہ)	۶/-
زاد سفر (حصہ اول)	۳/۰۰		
ISLAM & THE WORLD.	۴/۰۰		

ملنے کا پتا

مکتبہ میثاق (رحمانپورہ) اچھرہ لاہور ۱۲

محی الدین پرنٹر پبلشر نے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر میثاق رحمانپورہ اچھرہ لاہور ۱۲ سے شائع کیا۔